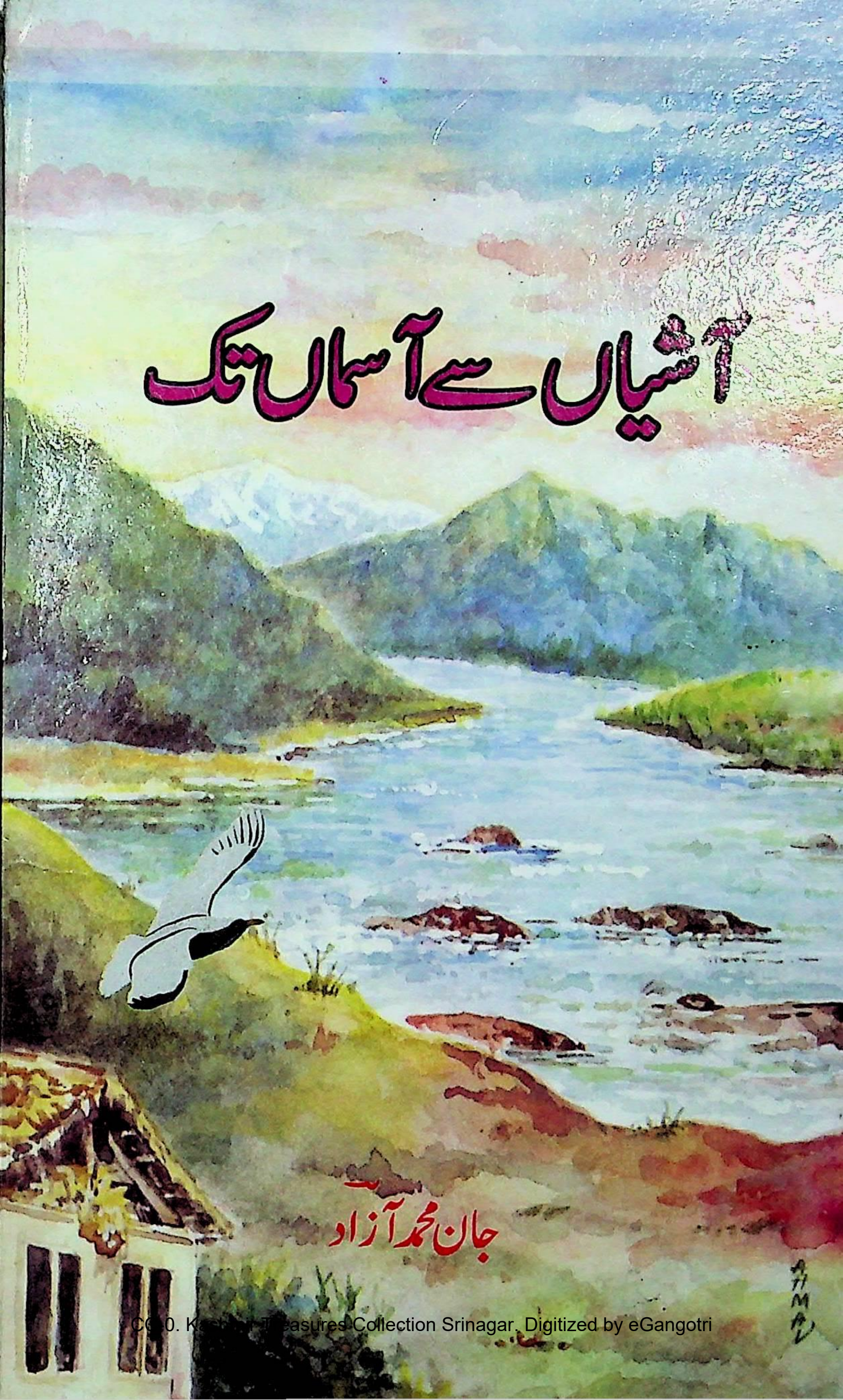

آشیاں سے آسماں تک
جان محمد آزاد

محترم سلیم سالک کے نام
نیاز مند خلوص کے ساتھ
برائے تبصرہ
جان محمد آزاد

آشیاں سے آسماں تک

جان محمد آزاد

اشاعت .... سنہ ۲۰۰۹ء

نظامت .... اُردو مرکز پبلکیشنز سری نگر

کمپیوٹر کمپوزنگ .... گورمیت سنگھ ترال (9906963854)

طباعت .... پرائم پرنٹنگ پریس

قیمت .... تین سو پچاس (-/350)

Collection of Short Stories

By

Jan Mohmad Azad

Soura Srinagar

یہ مجموعہ ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی جُزوی

مالی اعانت سے شایع ہوا ہے

اِنتساب

دریائے جہلم کے کنارے اپنے ازلی آشیاں

اور آسمان کو چھوتی ہوئی زوجیلا کی چوٹیوں کے اُس پار

کی سحر انگیز سرزمین کے نام!

مُوسمی پنچھی چلا

آشیاں سے آسماں تک

جاوداں پرواز پر!

جان محمد آزاد



پروفیسر حامدی کشمیری

پیشِ گفتار

بلاشبہ کشمیر سطح زمین پر فردوس منظر ہے۔ چلّوں کے سخت گیر اور یخ بستہ ایام گزرنے کے بعد موسم ایک نئی کروٹ لیتا ہے۔ قسم قسم کے مہکتے پھول دعوتِ نظارہ دیتے ہیں اور قدم قدم پر حُسن و جمال کے جلوے نظر آتے ہیں۔ کشمیر کی بہاروں پر متعدد نظمیں تحریر کی گئیں ہیں۔ مقامی شعراء کے ساتھ ساتھ غیر ریاستی شعراء نے بھی اس حوالے سے بعض ناقابل فراموش نظمیں تحریر کی ہیں۔

''جان محمد آزادؔ'' ہماری ریاست کے ایک معروف ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں سرزمین کشمیر اپنی تمام تر خوبصورتی اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ آپ کے افسانے گویا حُسنِ کشمیر کے آئینہ دار ہیں۔ آپ کا زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''آشیاں سے آسماں تک'' آپ کی کشمیر پرستی کا ایسا نگار خانہ ہے جس میں ٹنگی ہوئی پینٹنگس اور ڈرائینگس اپنے ایک مخصوص رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ یہ چتر کاری اور یہ تجزیہ دراصل آپ کی گہری بصیرتوں کا عکاس ہے۔!

''جان محمد آزادؔ'' سرزمینِ کشمیر کے عاشقِ حقیقی تصور کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ پیش نظر افسانوی مجموعے سے پہلے بھی آپ کی نگارشات میں کشمیر اور کشمیریت کا والہانہ اور عاشقانہ اظہار ملتا ہے۔ اہل کشمیر سے ناول نگار اور

افسانہ نگار کا جو تعلق خاطر ہے اُس کی مثال نہیں ۔ گویا وہ اور کشمیر ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں ۔ یہاں ''من دیگرم تو دیگری'' کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ سرزمین کشمیر کے ساتھ وہ جس شیفتگی سے وابستہ ہیں اُس کی رو سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا وہ خود کشمیر کے باطن میں رہتے ہیں یا پھر کشمیر ان کے باطن میں جاگزیں ہے ۔ وہ نہ صرف سرزمینِ کاشمیر کے حُسنِ ظاہری سے حد درجہ متاثر ہیں بلکہ اہل کشمیر کی شخصیت کے مُختلف پہلو یعنی درد و داغ، پسماندگی، خُدا ترسی اور انسان دوستی پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں ۔ آپ کے مشاہدے کی باریکی، جزئیات نگاری، نکتہ شناسی اور انسان دوستی دراصل آپ کی باطنی بصیرت کی غماز ہے ۔ زبان و بیان کی سنگلاخ مزاحمتوں کے باوجود آپ اس نوع کے بیانیہ کو سپاٹ نہیں ہونے دیتے بلکہ اپنی فہم وفراست سے اس میں شعریت کے رنگ تخلیق کرتے ہیں اور اس طرح ایک مختصر سے افسانے کو انکار واقدار کی نئی کائینات سے آشنا کرتے ہیں ۔ وہ بے جان اشیاء کو اس قدر متحرک اور جاندار بنا دیتے ہیں کہ ایک نیا تصوّر جنم لیتا ہے جس میں خیر وشر کا تصادم اور پھر خیر کی بالا دستی روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے ۔ نفسیات کی یہ تہہ در تہہ گرہیں کھولنا اور قاری کے شعور کو بالیدگی کی نئی رفعتوں تک پہنچانا آپ کے افسانوں کی بنیادی خوبی ہے ۔!

''جان محمد آزاد'' کے اندازِ بیان کی شعریت کے ساتھ ساتھ آپ کے بیانیہ کی دل آویزی ایسی خصوصیات ہیں جن کے نشان اُردو کے افسانوی ادب میں ہمیشہ باقی رہیں گے ۔! میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں ۔!!

حدیث میں ہے کہ مسجد نبوی میں ایک بلی نے کچھ بچے جنے تھے۔ چنانچہ یہ دیکھ کر کچھ صحابہ بلی کو وہاں سے بھگانے کے لئے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے کہ اسی اثنا میں حضور ﷺ مسجد میں نکل آئے۔ صحابہ کو بلّی کے پیچھے جاتے دیکھ کر حضورؐ صحابہ کے پیچھے دوڑے اور بلند آواز میں پکارتے رہے "ارے اسے مت مارو، یہ تو ماں بن گئی ہے!"

یہ عرفان نبویؐ کی ازلی کرنیں ہیں جو ہر دور اور ہر زمانے میں دلوں کو منوّر کرتی رہی ہیں۔ یہ گویا جاوداں دھوپ Eternal sunshine ہے۔ میں بچپن ہی سے مطالعہ حسن فطرت کا عادی رہا ہوں۔ نالہ سندھ کے کنارے میں جس دور افتادہ گاؤں میں پروان چڑھا۔ اُس آبائی گاؤں سے میرا ذہنی رشتہ ہر دور میں برقرار رہا۔ میں نے فطرت کے ساتھ اپنے گہرے تعلق کو ہر بلند و پست میں قائم رکھنے کی کوشش کی۔ میں Nature کے ساتھ اپنے اس زمانے کی ترسیل کو طفلانہ تمناؤں کو الفاظ کا لباس پہنانے کا متحمل نہیں ہو پایا۔ تب میں ان مناظر کے پس منظر میں کارفرما بڑی حقیقتوں سے بے بہرہ تھا لیکن زندگی نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو بڑی حقیقتیں میری جھولی میں ڈال دیں اُن سے منظر لا منظر ہو گئے۔ ان مناظر کے پس منظر کی بصیرتوں سے میرے جسم و روح میں گویا ایک وجدانی ارتعاش پیدا ہوتا رہا اور یہ کہانیاں جنم لیتی رہیں۔ اگر میں یہ

کہوں کہ ان کی تحریر میرے لئے کسی روحانی عمل سے کم نہیں تھی تو مبالغہ نہیں ہوگا۔

ابدیت اور روحانیت کی مظہر ان کہانیوں کا اسلوب فینٹاسی یا حکایتی ہے آج فطرت سے انسان کا تعلق کمزور ہو چکا ہے یا یوں کہیں کہ آج انسان فطرت سے وابستہ ہی نہیں رہا۔! چنانچہ نسیم سحر لوگوں کے درمیان سے گزر کر ان کے مزاج پوچھتی ہے لیکن کوئی اس کی آواز اس کی سوز اور گداز کو محسوس نہیں کرتا۔ پھول کی خوشبوئیں ہمارے لیے مہکتی ہیں آفتاب کی شعائیں ہمارے لئے چمکتی ہیں شمشاد و صنوبر کی شاخیں ہمارے لئے دھڑکتی ہیں لیکن بے چارہ انسان اپنی میکانکیت کی وجہ سے احسن تقویم کے باوجود اسفل السافلین میں مستغرق ہو چکا ہے۔ دوستی مروت وفا گئی گزری اصطلاحیں بن کر رہ گئیں ہیں آج کی نئی نسل اپنے بزرگوں سے ان کے فرسودہ خیالات سُننا قطعی پسند نہیں کرتیں کیونکہ بدقسمتی سے ان کے پاس نہ آنکھ کے آنسو ہیں نہ دل کی دھڑکنیں لیکن نا اُمیدی کی کوکھ سے ہی اُمید کی کونپل پھوٹتی ہے جہاں ایک امکان ختم ہو جاتا ہے وہیں دوسرا بہتر امکان انتظار میں رہتا ہے۔ اب جو امکان ختم ہو گیا ہم اُس کے فریادی کیوں بنے رہیں۔ بلکہ جو امکان باقی ہے ہم اپنی ساری توجہ اس کی طرف مبذول کریں۔ انسان کو چاہے بدلنے میں بہت دیر لگ جاتی ہو لیکن وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔

میں نے نیچر کے مختلف رنگ اور روپ لے کر اُن کی علامتیں تراشی ہیں اس منفرد علامتی نظام کو سمجھنا انتہا ضروری ہے ان کے سیاق و سباق کے

اندر جو مفہوم و معنی ابھرتے ہیں اُن سے تخلیقی سطح پر بعض لطیف حقیقتیں، جنہیں آپ اپنے معیار و میزان کی کسوٹی پر خود پرکھیں گے، آفتاب کی ارغوانی کرنوں کی طرح دمکنے لگتی ہیں۔ کاش فطرت کے عطیات کے میرے اِس مُشاہدہ اور اُجالوں کی اُڑان سے میرے طرح کے سبھی آس پنچھی یکساں طور مُستفیض ہو کر اپنی عاقبت سنوار سکیں!

ربِّ زدنی علما

جان محمد آزاد

شاداب منزل بڑھ پورہ

9622681428

آشیاں سے آسماں تک!

دریا کے کنارے کی جھاڑیوں میں بسیرا کرنے والے ہنس کے جوڑے کے لئے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ دن ہے یارات ___ جوڑے نے دریا کے کنارے پر اُگ آنے والی گھنی جھاڑیوں میں اپنا گھونسلہ بنایا تھا اور وہ اپنے اِس آرام دہ آشیاں میں دِن رات خوشیوں کے ترانے چھیڑتے رہتے تھے!

''یہ دریا آخر جاتا کہاں ہے؟'' گرمیوں کی ایک شام ہنسوں کے سب سے نوخیز بیٹے نے گھونسلے سے اپنی ننھی مُنی گردن باہر نکال کر اپنی ماں سے سوال کیا۔ ہنسنی حیران پریشان دریا کی سطح پر پگھلی ہوئی چاندنی کو دیر تک بہتی دیکھتی رہی اُس سے اپنے نٹ کھٹ بچے کے سوال کا کوئی معقول جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔ آخر اُس نے ایک بے معنی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میرے لال تمہیں تو یہ سوال اُس خوش نوا کونج سے کرنا چاہئے تھا۔ وہ تمہیں اپنے سحر انگیز نغموں میں بعض دلچسپ کہانیاں سناتی اس کے گیتوں

سے ایک عجیب آنند محسوس ہوتا ہے۔ ذرا ٹھہرو میں بھی اُس کی تقلید کی کوشش کرتی ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی ہنسنی نے اُس خوش نوا پرندے کے ترنّم کی نقل کرتے ہوئے ایک نغمہ چھیڑا۔ عجیب سا تھا یہ گیت ___ اس میں ہنسنی نے اجنبی شہروں کے گُم شدہ پرندوں کی آوازوں کو گڈمڈ کر دیا۔

اس آدھے ادھورے گیت کے ابہام کے باوجود سبھی بچے اس سے محظوظ ہوئے۔ وہ اپنی ماں کی تقلید میں اُس کی آواز سے آواز ملا کر یہ گیت گاتے رہے حتیٰ کہ اس گیت کے سوز و مستی نے انہیں خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا اور وہ سو گئے ___ پھر جب اُن کی آنکھ کھلی تو نہ جانے کیوں انہوں نے بے ساختہ پھر وہی راگ چھیڑا۔ دور مشرقی اُفق میں طلوع کی سُرخیاں اِس بات کی بشارت دے رہی تھیں کہ ابھی تھوڑی دیر میں آفتاب کی ارغوانی شعاعیں اُن کے آشیاں کو منوّر کر دیں گی ___!

☆

وقت کا دریا رواں دواں رہا۔ ہنسنی کبھی کبھی اپنے اِن ننھے مُنوں کو نیچے گھونسلے کی عافیت میں ہنس کے پاس چھوڑ کر خود گھنی جھاڑیوں کے اوپر ٹہنیوں پہ اکیلی گانے لگتی۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے گیتوں میں جذبات کی شدت پیدا ہونے لگتی۔ وہ پھدک پھدک کر ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر آ کر ایک رقص کی سی کیفیت میں سرمست رہتی۔ ہر دن گزرنے کے ساتھ اس کے گیتوں میں جذبات کی شدت پیدا ہونے لگتی۔ وہ دیر تک جیسے دریا کی لہروں سے مخاطب ہو کر گاتی رہتی تھی ___ دریا بہتا رہتا ___ کون

جانے کہاں ___؟ پھر اچانک اس خیال سے اُس کی پلکیں بھیگ جاتیں کہ اب کسی بھی دن اُسے اپنے ہنس اور اِن بچوں کے ہمراہ اپنے اس مضبوط اور جمے ہوئے آشیاں سے نکل کر ___ اس شتیل دریا کی لہروں سے دور ___ بہت دور ___ پرواز کرنی ہوگی۔ ایک اجنبی سرزمین کی طرف ___ جہاں سے وہ لوگ ہجرت کر کے آئے تھے "میں تو اب اُسے ایک اجنبی سرزمین ہی کہوں گی" کیونکہ ماہ وسال نے جیسے اُس کے ذہن سے اس سرزمین کی پرچھائیاں دُھندلا دی تھیں ___!

پہلے پہل وہ اِن مختصر اور سادگی میں لپٹے گیتوں کو اکیلی گایا کرتی تھی مگر پھر آہستہ آہستہ اُس نے اپنے معصوم بچوں کو بھی ان گیتوں کے آہنگ سے آگاہ کیا۔ آخر اُس کے یہ لختِ جگر بھی اُس کے ساتھ ہی اجتماعی ہجرت پر جانے والے تھے تب ہی ایک روز اُس کے اُسی نوخیز، نوعُمر اور نٹ کھٹ بچے نے نہایت معصومیت سے سوال کیا ___

"ماں! آخر یہ تمہاری اجنبی سرزمین ہے کہاں؟" ہنسنی نے پہلی کی طرح ایک بار پھر اُسی بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ___ "میں قطعی طور پہ نہیں بتا سکوں گی۔ سچ پوچھو تو مجھے خود بھی اِس بارے میں زیادہ واقفیت نہیں ہے۔!"

"غالباً یہ وشال دریا بھی اُسی سرزمین کی طرف جا رہا ہے۔" بچہ ماں کے جواب سے مایوس ہو کر سوچنے لگا لیکن اُس کی یہ معصوم اختراع حقیقت کے برعکس تھی۔ یہ پُرشور دریا اپنے پورے بہاؤ کے ساتھ ایک ایسے شہر کی

طرف بڑھ رہا تھا جہاں یہ متعدد پُلوں کی محرابوں سے گزر کر اپنی چھاتی پر مختلف اقوام کے ٹریفک کا بے پناہ اژدھام لئے تمام عمر کی خانہ بدوشیوں کے بعد سمندر کی اتھاہ آغوش میں سما جائے گا۔

''ماں! تم یہ اجنبی دیش کے نغمے کیوں گاتی رہتی ہو!'' نوخیز بچے نے اگلے روز پھر سوال کیا۔ آج اُس کی آنکھوں میں جیسے عرفان کی کرنیں چمک رہی تھیں۔ '' آخر ہم لوگ ان مُعطّر جھاڑیوں اور بید کے اِن درختوں کی گھنی چھایا سے کیوں نکلیں گے۔ اگر کہیں جانا ہی ہے تو کیوں نہ دریا کے اُس پار عظیم چنار کی چھاؤں میں اپنا آشیانہ سجائیں ___ '' نوعمر ہنس اپنی ماں کے پروں میں سمٹتا ہوا پھر نہایت پیار سے کہنے لگا۔ '' ماں! ہم لوگ اور کہیں نہیں جائیں گے۔ ہمیں کسی اور سرزمین کے خواب مت دکھاؤ۔ ساری کائنات میں کیا کہیں دریا کے کنارے کی ایسی حسین وجمیل جگہ بھی ہوسکتی ہے۔ ہم سب یہاں بہت خوش ہیں ماں ___ ! تم یہ انجانی دُنیاؤں کے سہادینے والے نغمے مت چھیڑا کرو ___ !''

بچے کی ان باتوں سے ممتا کا دِل بھر آیا۔ آج یہ صرف ایک نوخیز ہنس کی آواز نہیں تھی۔ یہ اب اُس کے سبھی بچوں کی اجتماعی فریاد تھی ___ '' ہاں ماں! دیکھو تو صُبح طلوع سے قبل آسمان کے کناروں پر کھلتا ہوا شفق اور پھر دریا کی مخملی لہروں میں منعکس ہونے والی شہد کی سی کرنیں ___ پھر اُن شاموں کا بھی احساس کرو ماں! جب ہم پاس پڑوس کے درختوں کی ٹہنیوں پر یہاں وہاں کہیں بھی آرام سے اُڑان بھر سکتے ہیں۔ نیلی وُسعتوں میں پرواز کر سکتے

ہیں۔ سر بفلک سفیدوں کی اونچی ٹہنیوں پر بیٹھ کر گیت گا سکتے ہیں اور پھر چاندنی کے اُترتے ہی گھاس ملی ہوئی مٹی کے اس آہن بستہ گھونسلے میں داخل ہو جاتے ہیں __ ! ماں __ آخر ہم خوشیوں کے ان شام و سحر سے انحراف کیوں کریں؟ کیا یہاں کوئی خفیف سا شور بھی ہماری خلوت میں دخل انداز ہوتا ہے؟ کیا کبھی کوئی کشتی ہمارے گھونسلے کے پاس ٹھہر کے ہمیں معمولی سا نقصان پہنچانے کی بھی مرتکب ہوئی ہے __ کیا کبھی دریا کی لہروں پر تیرنے والی روشنی نے ہمیں معمولی سا گزند بھی پہنچایا۔ __ نہیں ماں نہیں __ یہاں تو بارش کے قطرے بھی نہایت احتیاط اور آہستگی سے گرتے ہیں۔ اُس وقت ہمیں کتنا بھلا لگتا ہے جب ہم سبھی ایک دوسرے میں سمٹے ہوئے اپنے گرم گرم گھونسلے کی نرم نرم فرش پر بارش کے اِن قطروں کو پتوں پر گرتے ہوئے سنتے ہیں!"

نوخیز ہنس کی شرارتی چھوٹی آنکھوں میں یہ کہتے کہتے آنسو اُمنڈ آئے۔ "مجھے تو اپنا یہ گھر سورگ سے بھی سُندر لگتا ہے ماں! خدارا __ تم یہ اجنبی سرزمین کے گیتوں کا الاپ بند کردو __ !"

ہنسنی نے اپنے مجسّم سوال بچوں کو شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا __ "میرے جگر کے ٹکڑو __ لو آج میں تمہیں ایک اور گیت سناتی ہوں __ " یہ کہتے ہوئے ہنسنی نے اپنی لے بدل دی۔ اس نے ایک نیا گیت چھیڑا۔ یہ اس کے لڑکپن کے ایام کا گیت تھا۔ تب دِل کے اندر دراڑیں نہیں پڑی تھیں۔ ہر شئے سے عیش و نشاط کے سوتے اُبلتے تھے۔ تب اُس کا مسکن

یہاں نہیں تھا۔ وہ دور مسرّتوں کی ایک لہلہاتی اور جگمگاتی ہوئی دنیا تھی ___ آہ ___ خوشیوں کی اُس سرزمین میں اُس نے کتنے یادگار ماہ وسال گزارے تھے۔ کتنی مگن تھی وہ ___ پھر نہ جانے کیا ہوا ___؟ ایک دن وہ پُراسراری آواز جیسے خود اس کے وجود سے اُبھری ___ یہ تمہاری منزل نہیں ہے میری نادان ہمزاد ___!!

وہ اِس غیر مانوس آواز کی صدائے بازگشت سے پریشان سی ہو اُٹھی۔ اُس نے اِسے ان سُنا کرنے کی بھی سعی کی لیکن یہ آواز بار بار آکر اُس کی جنّت بداماں سرزمین میں ارتعاش پیدا کرتی رہی۔ پھر یہ آواز بتدریج بڑھتی رہی۔ اُس کے ساتھی ہنس نے بھی یہ آواز سُنی اُسے بھی اپنی دُنیا کے لٹنے کا احساس ستانے لگا۔

اور پھر ایک دن ___ انہیں چاروناچار اپنا وہ آشیاں۔ اپنی وہ دُنیا چھوڑ دینی پڑی۔ ہجرت کی طویل مسافتیں طے کرنے کے بعد ہزارہا میل کا سفر کرکے بلآخر وہ عظیم دریا کے کنارے اپنی اِس مانوس منزل تک پہنچ گئے۔ آخر بے انتہا ہمت اور جانفشانی کے بعد سمندروں، پہاڑوں اور ویرانوں کو پار کرکے اجتماعی ہجرت کرنے والے اپنی مخصوص منزل تک کیونکر پہنچے؟ اسرار کی گھنی دُھند میں لپٹے ہوئے اس سربستہ راز میں اُلجھے بغیر ہنسنی نے اپنے جوڑے کی مدد سے تنکے جوڑے اور نیا آشیاں تعمیر کیا ___!

''وہ جگہ کہاں تھی ماں ___ جہاں سے تم لوگوں کا جُھنڈ ہجرت کرکے آیا تھا؟'' چھوٹے ہنس نے پوچھا

''میرے نورِ نظر! وہی تو ہے جنتی سرزمین، میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ

وہ جگہ یہاں سے بہت دور ہے۔ لیکن کہاں ہے۔ یہ میں نہیں جانتی۔ میں نے تو تب بھی اُسی آواز کی صدائے بازگشت پہ یوں سمجھ لو لبیک کہا تھا اور اب یہاں تمہارے ساتھ اتنے پُرمسرت ایام گزارنے کے بعد پھر اُسی غیبی آواز کی اطاعت کر رہی ہوں ___ میرے بچو! ہمیں بہر صورت اُس اجنبی سرزمین کی طرف پرواز کرنی ہوگی چاہے وہ کہیں بھی ہو۔ ہمارا اعتقاد ہی ہمارا اعتماد اور راہبر ثابت ہوگا ___!

ماں کی اس نئی تاویل اور تشریح نے نوخیز ہنس کو بھی اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا وہ بے ساختہ پُکار اُٹھا "اگر تم میرے ہمراہ ہوگی ماں تو میں ضرور جاؤں گا ___" اُس رات سونے سے پہلے نوعمر ہنس نے بھی اجنبی سرزمین کے گیت میں اپنی ماں کی آواز کے ساتھ آواز ملائی۔

دوسرے دن ہنسوں کا جوڑا جب خوراک کی تلاش میں نکل گیا تو نوخیز ہنس پُھدک کر گھونسلے سے باہر آیا اور بید کی سب سے اوپر کی ٹہنی پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ ٹہنی پہ جھومتا ہوا اُسی انجانی سرزمین کا گیت گانے لگا۔

واہ کیا خوب آواز ہے! یہ قریب کی ٹہنی پہ بیٹھے ہزار داستان کے تاثرات تھے۔ ہزار داستان بُلبل کی سی شکل و جسامت کا پرندہ اپنے گہرے نیلے رنگ کے پنکھ پھڑ پھڑاتا اِس نوخیز پرندے کی آواز کا تمسخر بھی اڑا رہا تھا اور اس پر اپنی فہم و فراست کا رعب بھی ڈالنا چاہتا تھا ___ "میں تو بھئی بھانت بھانت کی بولیاں سنتا رہا ہوں لیکن یقین جانو میں نے آج تک اتنی پرسوز آواز نہیں سُنی ___!" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی لمبی زرد چونچ لہرائی اور چھوٹے ہنس کے پاس آ کر سنبھل کے بیٹھ گیا ___

''لیکن یہ تم گا کیا رہے تھے چھوٹے میاں؟!''

''یہ اجنبی سرزمین کا گیت ہے میرے بُزرگ ___!'' کمر عمر پرندے نے معصومیت سے جواب دیا۔

''کیا ___ کیا میں صحیح سُن رہا ہوں ___!'' ہزار داستان نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اجنبی سرزمین یہی کہا نہ تم نے ___ ارے اس دلدل میں بیٹھ کر ایسی عرش کی باتیں ___ یہ تو بھئی لُطف کی بات ہوگئی۔ مجھ جیسے سٹھیائے ہوئے پرندے کو بھی تم گویائی بصیرت بخش رہے ہو لیکن میاں ذرا اِس بات کی کچھ وضاحت تو کردو ___!''

''میں تو بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ ہم لوگ عنقریب ہی وہاں جا رہے ہیں''

''یہ بھی خوب رہی'' ہزار داستان نے جیسے قہقہہ بلند کیا۔ ''اس سادگی کا بھی جواب نہیں ۔ تو کیا تم واقعی اُس اجنبی سرزمین تک پرواز کرنے کے خواب دیکھتے ہو۔ تمہارے ماں باپ گویا کسی نئے اُفق اور کسی نئے شفق کی تلاش میں نکلنے والے ہیں۔ بھئی یہ افسانوی باتیں تمہیں مُبارک ___ میں تو اُڑ جاتا ہوں۔ خدا کرے کہ تمہارا یہ خواب خیال کا سا سفر خوشگوار ہو ___!''

''رُک جاؤ بڑے میاں ___ ''نوعُمر ہنس نے عاجزی کی۔ ''یہ تو بتاؤ کہ آخر تم اُس اجنبی سرزمین کے متعلق کیا جانتے ہو''

''یہ لو ___ تم تو اتنے چھوٹے ہو کر میرا مذاق اُڑانے پہ اُتر آئے۔ آخر کوئی کسی اجنبی دنیا کے متعلق کیا جاننے کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ یہ تو بس خیالی گھوڑے ہیں کہیں تک بھی دوڑا دو ___ لیکن تم جانو ___ ان حالات میں ہم تم

خواب وخیال ہی کر سکتے ہیں بس___!''

''تو کیا اے میرے بزرگ تم وہاں ہجرت نہیں کرو گے؟'' اُلجھن کے شکار ننھے پرندے نے پوچھا۔

''نہیں تو___ میں بھلا کیوں جانے لگا___ میں تو بھئی یہیں خوش ہوں۔ مگر سُن لو میں اِس قدر ضعیف الاعتقاد بھی نہیں۔ آخر ہم یہ بات کیونکر مان لیں کہ کہیں کوئی اجنبی دنیا بھی ہے___!''

''کیوں___ میری ماں تو یہی کہتی ہے'' نو عمر ہنس نے بے پناہ اعتماد سے کہا۔

''میاں تم بھی کمال کرتے ہو۔ کیا تم اپنے ماں باپ کی ہر اوٹ پٹانگ بات کو برحق سمجھتے ہو کل اگر وہ تم سے آکر یہ کہہ دیں کہ ہمارا مسکن چاند پر ہے تو غالباً تم اُس پر بھی یقین کر لو گے۔ کیوں!؟''

''ہاں___ یقین تو کر لینا چاہئے مجھے___ کیوں کہ اُنہوں نے مجھے کبھی دھوکہ تو نہیں دیا۔!'' ہنس نے فوراً جواب دیا۔

''بھئی میں نے یہ کب کہا کہ وہ تمہیں دھوکہ دے رہے ہیں۔ دراصل وہ لوگ قدرے جاہل ہیں۔ بے چاری بے خبر مخلوق لیکن میں بھی خوامخواہ تم جیسے حقیر کے ساتھ معیار و میزان کی باتیں لے بیٹھا۔ ہونہہ___!''

ہزار داستان نے اپنی داستان کے اوراق سمیٹے اور اپنے پر پھڑ پھڑاتا ہوا فضا میں تحلیل ہو گیا_____

اُس شام موسم نے اچانک کروٹ بدلی۔ بید اور صنوبر کے اونچے درختوں کے اوپر سے آسمان پر شفاف بادل آتے گئے اور اونچے اونچے حلقے

بناتے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹپاٹپ بوندیں برسنے لگیں۔ نوعمر ہنس اور اُس کے بھائی بہن افسردہ نظروں سے دریا کو دیکھنے لگے۔ بادوباراں کا یہ حال ہوگیا___ جیسے دریا اپنے کناروں کے باندھ پھلانگ کر اُمنڈ آنے کو بے چین ہو۔ نوعمر ہنس حیران پریشان بے ساختہ اپنی ماں سے یہ پوچھ بیٹھا۔

''ماں آج یہ آسمان اتنا ناراض اور یہ دریا اتنا بپھرا ہوا کیوں ہے؟''

''سورج کل پھر چمکے گا میرے بچو! دراصل اب دِن چھوٹے ہو رہے ہیں اور آندھی نے آج کے دن کو کچھ زیادہ ہی مختصر کردیا ہے۔ شُکر ہے کہ باہر کی اس سردی کا ہمارے گھونسلے کے اندر کوئی اثر نہیں___ میرے سادہ لوح بچو___ کیا تم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ گرمیوں کی تمازت سال بھر قائم رہے گی___!''

ماں چہچہاتی ہوئی اُنہیں گھونسلے کے اندر لے آئی۔ اُس کی چہچہاہٹ سُن کر بچوں کے دل موم کی طرح پگھل گئے۔ وہ سبھی اُس کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملانے لگے لیکن نوعمر آج اُن کے اِس گیت میں شامل نہیں ہو پا رہا تھا۔ بہت دیر بعد___ جب یہ آوازیں بند ہوئیں تو وہ اپنے اندیشے زبان پر لے آیا۔

''لیکن کاش ہم اُس اجنبی سرزمین کے متعلق بھی کچھ جان پاتے___!''

اپنے اِس ننھے مُنّے کے تجسس سے متاثر ہوکر ہنسنی بے قرار ہو اُٹھی___ ''میرے جگر کے ٹکڑو۔ اِس دُنیا میں خوشی صرف اُس کے لئے ہے جو خوشی کے بغیر خوش رہنا سیکھ لے۔ آنے والا دن ہمارے لئے اپنی تمام اُمیدوں

کے ساتھ زندہ ہے لیکن ہم اِس کے حوالے سے جتنی کھوج کریں گے ہمیں اتنی ہی نا اُمیدی ہوگی ___!"

اس کے ساتھ ہی ہنسنی نے اپنے گیت کی لےَ اور تیز کردی۔ اِس گیت میں حیات کے امکانات کچھ اور اُبھر کے آرہے تھے۔ یہ تمہاری منزل نہیں ہے ___ دریا رواں دواں ہے۔ بادل بھی آگے بڑھتے آرہے ہیں آندھی ریگِ رواں کی طرح گزر رہی ہے۔ کسی شئے کو قرار نہیں ___ دریا سے پوچھو ___ بادلوں اور آندھی سے دریافت کرو ___ آخر یہ سبھی کس جانب رواں دواں ہیں ___؟ دھرتی کو منّور کرنے والے اس عظیم سورج سے دریافت کرو۔ جب وہ مغرب کی لحد میں اُترتا ہے تو آخر اُس کی منزل کہاں ہوتی ہے ___؟ ایک اجنبی منزل ایک اجنبی سرزمین ___ غالباً سبھی کی وہی ایک متعّین منزل ہے۔ ٹھیک اِسی طرح جب ہمارا مقررہ وقت آئے گا تو ہم بھی اُس انجانی منزل کی طرف پرواز کریں گے ___"

"ماں سچ پوچھو تو مجھے تمہاری اس خرافات پر اب یقین نہیں رہا۔!" اِنتشار اور اُلجھنوں کے شکار نوخیز ہنس نے جرات مندی سے کہا۔ ماں کے اصرار پر اُس نے بزرگ ہزار داستان سے اپنی بات چیت کا احوال بیان کیا شفیق ماں نے شکوک و شبہات میں پھنسے اپنے لختِ جگر پر ایک نگاہ ڈالی ___ "سنو میرے بچو ___ آج تمہاری ماں تمہیں ایک اور گیت سناتی ہے ___!"

اُس نے ایک بار پھر اُسی آفتابی سرزمین کے سحر انگیز نغموں کے تار چھیڑ دئے لیکن اس نغمے میں تلقین اس بات کی تھی کہ اُس نے کسی تحقیق کے

بغیر اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کرلی تھی۔ اُس نے وہ افق اور وہ شفق ڈھونڈ نکالے تھے جنہیں چھوڑ کر وہ بلاوجہ نکل آئی تھی۔ اِس کھوئی ہوئی جنّت کا راستہ کس کہکشاں سے گزرتا ہے۔ وہ اس بات سے بے نیاز تھی۔ بس اُمید اور اعتماد نے اسے سمندروں کی بیکراں وسعتوں کو عبور کرنے کا حوصلہ دیا ۔اعتقاد نے اُس کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا کیونکہ اعتقاد کی حیثیت دِل کے صحرا میں ایک نخلستان کی سی ہے۔

''میرے بچو پس جان لو___ یہی تمہارا ابھی مُقدّر رہے___!''

سبھی بچے ممتا کے مقدس جلووٗں سے مستفیض ہو رہے تھے۔ وہ اپنی ماں کی محسوسات کی طرف گوش برآواز تھے___ ''میرے عزیز بچو! میں نے جس آواز کے کہنے پر لبیک کہا۔ وہ رحم و کرم کی آواز تھی۔ جب میں دریا کے کنارے اس گھنی جھاڑی میں پہلی بار پہنچی تھی تو ایک نظر میں ہی مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میں اِس جگہ سے بخوبی واقفیت رکھتی ہوں۔ پھر میں نے تمہارے باپ کی اعانت سے یہاں ایک آشیاں بنایا___!'' اب وہ نوخیز ہنس سے مخاطب ہوئی ''کاش اُس ہزار داستان نے اُس وقت میری کیفیت دیکھی ہوتی۔ کیونکہ تب میں اپنے ان بچوں کے لئے آشیانہ بنا رہی تھی جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ غالباً وہ میرے آشیانہ بنانے کو میری حماقت پر محمول کرتا لیکن اے میرے نورِ نظر___ کیا وہ محض میری ذہنی اختراع تھی___ کیا میری اُمید اور میرے اعتماد نے مجھے دھوکہ دیا___؟''

بچے اِس امر سے آگاہ تھے کہ رحم و کرم کی آواز نے اُن کی ماں کی صحیح راہنمائی کی تھی چنانچہ یہ اُسی راہبری کا نتیجہ تھا کہ وہ بعد میں ننھے منے بچوں کی

خوشی سے نہال ہوگئی اور آج وہ اپنے بچوں کو حیات کے اسرار سے آگہی دلا رہی تھی ــــــ

''میرے بچو ــــــ ہزار داستان جیسے خود ساختہ زیرک پرندوں کو اپنی بولیاں بولنے دو۔ لیکن یہ بات ذہن نشین کرلو کہ تمہاری ذات سے اُبھرنے والی رحم وکرم کی آواز کبھی دھوکہ نہیں دے سکتی ــــــ! دراصل جب اعتقاد اور اعتماد غیر متزلزل ہو تو وسوسوں اور خدشات کے پھنکارتے ہوئے ناگ ہمارے آشیاں کے قریب بھی پھٹک نہیں سکیں گے ــــــ!''

☆

خزاں کے رنگ بدلتے کئی ہفتے گزر گئے۔ اب ہوا میں ٹھنڈ بڑھنے لگی۔ درخت بے برگ وثمر ہوگئے۔ ہنسوں کے آشیاں میں رخصتی کے گیت زیادہ جوش وجذبے سے بُلند کئے جانے لگے۔ اِن گیتوں کے بول اِس بات کا واضح اشارہ دے رہے تھے کہ اجنبی سرزمین میں انجانی خوشیاں اُن کی راہوں میں آنکھیں بچھائی ہوئی ہیں لیکن پھر ایک نیم تاریک صُبح جب پرندے دانہ دُنکا چُننے کے لئے اپنے گھونسلوں سے باہر گئے ہوئے تھے تو بادلوں کی زبردست گھن گرج نے ماحول کو دہلا کے رکھ دیا۔ پھر اس کے ساتھ ہی سخت بارش ہونے لگی۔ ہنسوں کا گھونسلہ نہایت شکستہ نظر آنے لگا۔ اِس کی نچلی سطح میں کہیں سے نمی بھی پیدا ہونے لگی۔ بے چارے نوعمر ہنس اس شکستہ گھونسلے میں بے یارومددگار سہمے پڑے رہے۔ ان کے ماں باپ گھونسلے سے باہر تھے۔ سراسیمہ نونہال دیر تک اُن کی راہیں تکتے رہے پھر تھک ہار کر آخر اُن کی تلاش میں باہر نکلے حالانکہ اُن کے بال وپر ابھی اس پرواز کے متحمل

نہیں تھے لیکن موسم کی تندی کے سامنے اُن کے دل میں ماں باپ کی محبت غالب آگئی اور وہ بے تحاشہ پُھد کتے ہوئے ہر ممکنہ جگہ پر ہنسوں کے جوڑے کو تلاشنے لگے۔

طویل تلاش کے بعد آخر وہ انہیں دریا کے پار چنار سے گرے ہوئے پتوں کی شطرنج پہ پڑے ہوئے نظر آئے۔ اُن کا باپ بے چارہ دم توڑ چکا تھا لیکن اُن کی ماں ابھی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ دم توڑتی ممتا اپنے پریشان حال بچوں کی چیخیں سہن نہیں کر سکی۔ ممتا سے مغلوب اُس کی نہایت نحیف بڑبڑاہٹ میں جیسے کاینات کا سارا کرب اُمنڈ آیا تھا__

"میرے جگر کے ٹکڑو__ اس جگہ سے فوراً ہجرت کرلو__ ہاں ہاں__ اُسی اجنبی سرزمین کی طرف__ وہی آواز__ جو آج تک ہماری راہبری کرتی رہی ہے__ آج تمہیں بھی پکار رہی ہے۔ اپنے پورے اعتماد سے اِس آواز کی تعمیل کرو۔ اب جلدی کرو میرے__ بچو__!"

"لیکن ماں__ ہم سب تمہارے بغیر......" نو عمر ہنس کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔

"نہیں __ اب ہم تمہارے__ ہمراہ__ نہیں ہوں گے __ ہم تو__ ہم تو خود کسی اور__ اجنبی دنیا میں جانے والے ہیں __!"

یہ کہتے کہتے زخمی ہنسنی کی لمبی گردن اُس کے سفید بدن پر لڑھک کے رہ گئی__! بچوں نے اپنی معصوم آنکھوں میں جیسے غم کے سمندر چھپالئے۔

اُمید و بیم میں کافی دیر تک ڈوبنے اُبھرنے کے بعد ___ بلآخر اُنہوں نے ___ اپنے مُردہ ماں باپ پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی۔ اپنا سارا اعتماد مجتمع کیا اور فضائے بسیط میں اُڑان بھرلی۔ اُن کی منزل گو بہت دور تھی لیکن وہ بادِ مخالف کی تُندی سے بے نیاز اُفق کی موج کے اُس پار سات رنگوں کی دھنک میں محوِ پرواز رہے ___ !

☆

اُجالوں کی اُڑان

آسمان بوس چوٹیوں کا آخری سلسلہ عبور کرتے ہی وُسعتِ نگاہ تک دُھند میں لپٹی ایک سحر انگیز وادی پھیلتی گئی۔۔۔۔۔۔ شفاف برف چومتے ہوئے موسمی پرندوں کی صفوں میں اس منظر نے مسّرت کی لہر دوڑا دی۔ ہزاروں معصوم رنگ برنگے مہاجر پرندوں کی آنکھوں میں سپنے چمک اُٹھے۔طویل ترین سفر نے اِن کے پر توڑ کے رکھ دئے تھے لیکن بچھڑی ہوئی سر زمین کے دائیرہ رنگ و بو میں داخل ہوتے ہی جیسے ان کے بدن میں نئی امنگ بیدار ہوئی جیسے افلاک کی نیلاہٹوں میں کھونے والوں کو صبر آزما ماہ وسال کے بعد اپنی گُم گشتہ اِرم واپس مل گئی ہو۔انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر اپنی چھوڑی ہوئی عزیز چیزوں کا لمس حاصل کر سکیں گے۔ پرانے موسموں کی فردوسی آواز ان کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔وہ بے اختیار اس آواز کے ساتھ آواز ملانے لگے۔اب ان کی سیں سیں، چڑ چڑ اور غاوں غاوں سے برفستان کی فضا گونج اُٹھی۔ ان کے پنکھ اب زیادہ برق رفتاری سے پرواز کرنے لگے۔۔۔۔!

طویل جاڑوں کے بعد بہار کی دستک کے ساتھ وادی میں داخل ہونے والا موسمی پرندوں کا یہ پہلا قافلہ تھا۔ ان پرندوں نے سات سمندر پار سے ہزاروں میل کا سفر طے کیا تھا۔ اجتماعی ہجرت کا یہ طویل اور خطرات سے بھرپور سفر پرندوں نے بے پناہ ہمت اور جان فشانی سے طے کیا تھا اس سفر کے دوران ان کے ان گنت ساتھی بیکراں سمندروں، کہساروں اور ویرانوں کے نذر ہو گئے تھے لیکن خوابوں کے پرندوں کا یہ کارواں اجالوں کے سفر پر رواں دواں رہا۔۔۔۔۔۔!

بہت نیچے دریا کی لکیر، جھیل کی پیالی اور چناروں کے سائے بتدریج واضح ہوتے جا رہے تھے پرندے اب چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر پرواز کرنے لگے۔ پاک پاکیزہ آب زم زم سے دُھلے دُھلائے ابابیلوں کے جوڑے نے شہرِ پناہ کے نقش پہچانتے ہی اپنے پرانے آشیاں کی تلاش شروع کر دی۔ ہر سال ہجرت کر کے واپس آتے ہی وہ کسی دِقت کے بغیر اپنے گھونسلے میں واپس پہنچ جایا کرتے تھے جیسے اُسی وقت وہاں سے اُڑان بھر کے واپس آ رہے ہوں۔ اس لحاظ سے ابابیلوں کے جوڑے کا حافظہ غضب کا تھا لیکن اب کے کیفیت کچھ مختلف نظر آ رہی تھی۔۔۔۔۔!

شہر آج پرایا پرایا سا لگ رہا تھا۔ کہیں کوئی گہما گہمی نہیں تھی۔ ملول سی بستی میں ہر سمت ایک پہرہ تھا۔ ہر سمت اک پیاس تھی۔ تھکے ہارے پرندے اس خوف و ہراس کی بو باس سے سہم کے رہ گئے۔ ہانپتے کانپتے بے چارے چنار کی ایک ٹہنی پر آ کر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔ ان آنکھوں میں نہ جانے کتنے وسوسے اور خدشات تھے۔ یہ

آنکھیں کبھی گہری سفید، کبھی گہری سرخ اور کبھی سیاہی مائل ہو جاتیں۔ ان کے پنکھوں کی ازلی چمک بھی جیسے ماند پڑ رہی تھی۔ مادہ ابابیل سے آخر ضبط نہیں ہو سکا۔!

''اگر یہ وہ شہر نہ ہوا تو سمجھ لو ہم برباد ہو جائیں گے۔ اب ہم کسی نئے سفر کے متحمل بھی تو نہیں رہے!'' ''بھولی ہو تم تو۔۔۔۔'' نر نے اس کی تردید کی ''ہمارا اندازہ بھلا کبھی غلط ہوا ہے۔ یہ سیاہ اور کڑوا دھواں جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے ہٹ جانے دو۔۔۔۔ پھر ہمیں اپنے مسکن کے آثار تلاشنے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھو نیک بخت۔۔۔۔!''

ابھی نر ابابیل کے تسلی کے الفاظ مکمل بھی نہیں ہو پائے تھے کہ چنار کی شاخوں میں ایک پھنکار کی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ ابابیلوں کے حساس حِس ایک دَم مُستعد ہو گئے۔ پھر جوانہوں نے دیکھا تو سامنے کی ٹہنی میں اُلجھا ہوا ایک سیاہ ناگ پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ پھنکارتا ہوا اپنی زہریلی زبان باہر نکالے آگے بڑھ رہا تھا۔۔۔۔۔!!

ابابیلوں کے انگ انگ میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اُنہوں نے ایک لمبی اُڑان لے کر کہیں دور چلے جانے کا عزم کیا۔ لیکن شہر کے سارے پھاٹک بند کر دئے گئے تھے۔ اونچی فصیلوں پر وردی پوش سخت پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے جوتوں کی صداؤں میں نہ جانے کیا دہشت تھی کہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ ترکش میں سے کسی بھی لمحے تیر نکل کر معصوم پنچھی کے جسم میں پیوست ہو سکتا تھا۔ یا پھر بندوقوں میں سے کسی سرپھرے کی

چلائی ہوئی گولی بے ضرر پرندے کو بھون کے رکھ دیتی۔ دھوئیں کی مہین چادر میں سے ابابیلوں نے دیکھا کہ فصیل کے نیچے سلاخوں میں کچھ نیم مردہ پنچھی گل سڑ گئے تھے لیکن بعض نامراد اب بھی پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ان کی کربناک چیخوں کی آنچ سے ابابیلوں کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔۔۔۔۔!

ہانپتے کانپتے پرندوں کا جوڑا بلاآخر جھیل کے کنارے نکیلی پتیوں والے ایک دیو قامت درخت پر آکر ٹھہر گیا۔ میلے اور کثیف بادلوں سے بھرے آکاش کے دامن میں 'زبرون' کے سلسلے گم سم اور حیران تھے۔ 'پری محل' الگ ایک گوشے میں سہما ہوا سمٹا تھا۔ حد نگاہ تک پھیلی ہوئی 'ڈل جھیل' اُداس اور مغموم تھی۔ نہ کہیں مخملی لہریں تھیں نہ اُن کا رقص۔۔۔۔! دونوں پرندے اپنے پیروں میں سر چھپائے اُسی جگہ ساری رات بھوکے پیاسے پڑے رہے۔

صبح صادق کی دُھندلی چمک جب جھیل کے پس منظر میں آہستہ آہستہ نکھرنے لگی تو آبی پرندوں کی گھٹی گھٹی آواز نے انہیں ہڑبڑا کے بیدار کر دیا۔ صبح کی سفیدیوں میں رات کی سیاہیوں کو ایک بھیانک خواب سمجھ کر ابابیلیں چند لمحوں کے لئے مطمئن سی ہوئیں۔ انہوں نے پاک پاکیزہ ہو کر اپنے خالق کی عظمت کے ترانے چھیڑے اور پھر نہایت مترنم آواز میں پرانے موسموں کو آواز دینے لگیں۔

وہیں درخت کی چھاؤں میں جھیل کے کنارے دو سارس خاموش کھڑے تھے۔ انہیں غالباً ابابیلوں کا گیت پسند نہیں آیا۔ وہ قیں قیں کی احتجاجی چیخیں بلند کرتے ہوئے ہیں دور کی پرواز پر نکل گئے۔ تب ہی ایک

سفید راج ہنس اُڑتا اُڑتا آ کر ابابیلوں کے پاس بیٹھ گیا۔ نر ابابیل نے دُعا سلام کے بعد اُس سے ساری بات کہہ دی۔ راج ہنس نے ساری بات سن کر کہا:

'میں ٹھہرا سیدھا سادہ! قبلہ آپ تو فہم و فراست کے مالک ہیں۔ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھے۔! اس شہر پر تو سمجھو بہت بُرا وقت آن پڑا ہے۔ یہاں بہار کی کوئی شگفتگی نہیں۔ یہاں اب کوئی پرندہ گھونسلہ نہیں بناتا۔ تم لوگ یہ کہاں آ نکلے ہو۔۔۔؟''

راج ہنس کے اس حوصلہ شکن انکشاف نے ابابیلوں کو بے حد رنجیدہ کر دیا۔ وہ ہنس سے کہنا چاہتے تھے کہ یہ تو ان کی اپنی گم گشتہ ارم ہے۔ وہ پچھلے سال ہجرتوں سے پہلے اپنا گھونسلہ یہیں چھوڑ آئے تھے۔ اپنا نہایت عزیز گھونسلہ ۔۔۔۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہہ پاتے اچانک ۔۔۔۔ دور ۔۔۔۔۔ ایک زبردست دھماکہ ہوا ۔۔۔۔۔!

ابابیلوں کے دل دہل اُٹھے۔ راج ہنس اپنے پر پھڑپھڑاتا کہیں بھاگ گیا اور دور دُھندلے آسمان کے سیاہ بادلوں میں کبوتروں کی ایک تکونی صف دھواں ہوگئی۔

اس ہلچل میں ابابیلوں کا سراسیمہ جوڑا اُڑتا ہوا دریا کے کنارے اُس پرانی وضع کی حویلی کے پاس پہنچ گیا۔ یہ وہی پرانی پکی اینٹوں کا مکان تھا جس پر چڑھا ہوا پلاسٹر جگہ جگہ سے اُکھڑ گیا تھا۔ اسکے پائین باغ کا سبزہ زار اور صدا بہار کے پیڑوں کی قطار گویا قصہ پارینہ ہوگئے تھے ۔۔۔!

لیکن اس کا دریا کی طرف نکلا ہوا منقش لکڑی کا چبوترہ اب بھی ویسا

ہی تھا۔ ابابیلوں نے اپنا آشیاں پہچان لیا تھا۔ انہیں اپنے گم گشتہ نشیمن کے آثار مل گئے تھے۔ یہی وہ منزل تھی جسکے تلاشتے ہوئے وہ شکستہ ہو گئے تھے۔۔۔! تاہم یہ منزل آج قدرے غیر مانوس نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں حویلی کے شکستہ دریچے پہ بیٹھے دیدہ نم بار بار اندر تاک جھانک کرتے رہے۔ اندر دیوار گیر الماریوں میں سینکڑوں کتابیں اب بھی ویسے ہی قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن آج ان موٹی موٹی کتابوں پر گرد کی دبیز تہہ موجود تھی۔ تب ہی گھر کی مالکن وہاں آنکلی اس نے پہلی ہی نظر میں انہیں پہچان لیا۔ اُس نے سفید سفید بالوں کی لٹوں کو ماتھے سے ہٹا کر ان کے لئے پاک وصاف پیالیوں میں پینے کا پانی رکھا۔ پھر تازہ روٹی کے ٹکرے پرندوں کے پرانے گھونسلے کے قریب روغنی طاق پہ ڈال دیئے۔ شناسا ماحول میں داخل ہوتے ہی پرندے جیسے تعبیر کی خوشبو سے مہک اُٹھے۔!

ان کا پرانا آشیاں جوں کا توں تھا لیکن اس کے اندر ایک ناخوشگوار سی بو بسی تھی۔ جوڑے نے سب سے پہلے اس کی تطہیر کا کام شروع کیا۔ وہ بہت دور کھیتوں میں جا کر انتخاب کر کے تنکے لاتے رہے۔ یہ نہایت طویل اور صبر آزما کام تھا لیکن ابابیل اس کام میں ہمیشہ مشتاق تھے۔ پرندوں کی ساری برادری ان کے فن کی گویا معترف تھی بلکہ بعض پرندے تو اپنے آشیاں کی آرایش کے لئے ابابیلوں سے مشورے تک طلب کرتے تھے۔ چند ہی دنوں میں پرُانا آشیاں نئے تنکوں کی زیبایش سے نِکھر گیا لیکن اس قدر آرایش اور طہارت کے باوجود گھونسلے کی دُرگندھ دور نہ ہو سکی۔ ابابیل حیران تھے۔! گرد وپیش کے ماحول نے انہیں ویسے بھی حیران و پریشان

کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔۔۔!!

اُدھر حویلی کے پائین باغ میں سرخ گلابوں اور یاسمین کی نِکہتوں کا زمانہ فسانہ ہو گیا تھا۔ پہلے یہاں نرگسوں کے درمیان انار کی شاداب چھاؤں تلے وہ شنا سا میزبان بیٹھا لکھتا رہتا تھا۔ وہ اپنے لمبے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیرتا اپنے آپ کے ساتھ گُنگناتا ہوا بس لکھتا رہتا۔ دریا کی لہروں کے مدہم سے ساز پر ایک موسیقی چاروں طرف لہرا رہی ہوتی۔ رنگین پھول مسکراتے رہتے۔ تتلیاں مخمور سی جھومتی رہتیں۔ پھر جب ابابیلیں پاس ہی سے اپنا آگہی کا گیت گانے لگتیں تو فضائیں جیسے مقدس اور منوّر ہو جاتی تھیں۔!

وہ صُحبت اہل صفا اب خواب و خیال ہو گئی تھی۔ خود نر ابابیل نے اپنی مادہ کو سمجھانے کی ساری کوششیں ترک کر دی تھیں۔ حقیقت کا بھیانک چہرہ اب بے نقاب ہو گیا تھا۔ حویلی کے رنگ شہر پہ چھائے ہوئے دھوئیں میں تحلیل ہو گئے تھے۔ شناسا میزبان اب یاس تنہائی اور گوشہ نشینی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ وہ صبح شام گرد کی تہہ تلے دبی ہوئی اپنی کتابوں کی اور دیکھتا رہتا۔ کتابوں پہ کہیں کہیں مکڑیوں نے جالے بنا دئے تھے۔ تار عنکبوت میں پھنسے حقیر کیڑے مکوڑے موت کے پنجوں کو اپنی اور بڑھتے دیکھتے۔ گوشہ قفس میں اب شام و سحر ایک پُر ہول سناٹا طاری رہتا۔! سب لوگ محض اس لئے زندہ تھے کیونکہ ابھی ان کی سانسیں چل رہی تھیں۔ باہر رقص آتش و آہن جاری تھا۔ کسی بھی پل دھماکے کا خدشہ رہتا تھا۔ پھر دھوئیں کی چادر بھی گاڑھی ہو جاتی تھی۔ شعلے اُبلتے تھے۔ سیاہ بادلوں کے سائبان سے ساری دھرتی ڈھک

جاتی۔تب ہی سیں سیں چڑک چڑک کی پھٹپھٹاتی آواز سے فضا گونج اُٹھتی اور سینکڑوں کی تعداد میں پرندے ظلمتوں میں کہیں دور کھو جاتے۔

اُس دن بھی شہر کے سارے پھاٹک بند تھے۔فصیلوں پہ بندوق برداروں کا کڑا پہرہ تھا۔ ہر طرف اک کہُرام سا مچا ہوا تھا۔شکستہ حویلی کی محرابوں میں آندھیاں چیخ رہی تھیں اور آتشیں بگولے چکر لگا رہے تھے۔ خوف سے کانپتا پرندوں کا جوڑا اپنے آشیاں میں سمٹ کے رہ گیا۔!

سیاہ اور کڑوا دھواں دیوار گیر کتابوں کی الماریوں پہ پھیلتا ہوا پھر ان کے آشیاں میں گھسنے لگا تھا۔شناسا میزبان اپنے بالوں پہ ہاتھ پھیرتا زیرلب پھر کُچھ بڑبڑا رہا تھا۔اُس کے لب غیر ارادی طور ہل رہے تھے۔شاید اُس کے دل کے داغوں اور روح کے زخموں کو زبان مل گئی تھی۔شاید شہر بولنے لگا تھا یا پھر اُس کے باطن کی بڑبڑاہٹ تھی یہ۔۔۔۔۔۔ابابلیں ہمہ تن گوش تھیں۔۔۔۔!

''میرے موسمی پنچھی نے جب یہاں تک کی اُڑان بھر لی تھی تب یہ زمین کسی قدر شاداں تھی۔کتنا چہکتی تھی یہ۔۔۔۔۔۔۔ کتنی آرزوں اور تمناؤں سے میں نے اس نشیمن کی آرایش کی تھی۔حالانکہ ہجرت میرا مقدر تھی لیکن رواں رواں زندگی کی محبتیں بھی بے پناہ تھیں۔لیکن اب یہ دیش بے گانہ ہو گیا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ بندھی ہوئی زنجیروں کو توڑنا ہوگا۔! دھوئیں سے اب میرا دم گھٹ رہا ہے۔اف۔۔۔کیا بیکراں نیلی وسعتوں میں کوئی مجھے پناہ نہیں دے گا۔۔۔۔۔!''

مادہ ابابیل سے رہا نہ گیا۔۔۔۔''نہ جانے کیا اناپ شناپ کہہ رہا

ہے۔لگتا ہے بے چارے کا دماغ پھرِ گیا ہے۔" مادہ نے ہمدردی سے کہا اور اپنے گھونسلے میں کُچھ اور سمٹ گئی۔

"بھلی مانس ----- بھولی ہو تم تو ----- چپ چاپ بیٹھو اور اطمینان سے سنتی رہو۔!" اس کے ساتھ ہی دونوں ایک بار پھر شناسا میزبان کی طرف متوجہ ہوئے۔ جیسے یہ آواز کہیں گہرائی سے آرہی تھی!

"------کاش -----! میں دور دیس سے آنے والے ان الف لیلوی پرندوں کی آوازیں سن پاتا۔ میں تو بس ان کے یہ مقدس چمکیلے پر ہی دیکھ پاتا ہوں---- وہ بھی بس ایک لحظہ کے لئے---- میں ان کی آوازیں سُننے کا نہ جانے کتنے برسوں سے مشتاق ہوں۔ بیکراں نیلی وسعتوں میں ان کی چہکار کا ترنم باطن کی خوبصورتی کی غمازی کرتا ہے۔کاش میں اس خوبصورتی کو چھونے کا متحمل ہوسکتا۔ کاش۔ مجھے اتنی بصیرت نصیب ہوتی کہ میں آواز کے پردے پر ان کے اندر کی خوبصورتیوں کو بھی دیکھ پاتا---- جب تک میں یہ آوازیں نہ سنوں ان کی بولیاں نہ سمجھوں تب تک یہ اجنبیت بھلا کیوں کر دور ہوگی----! تب تک مجھے اس ناخوشگوار دھوئیں کی گھٹن سے کیسے نجات ملے گی۔ انسانی تاریخ اور بعض روایات کے مطابق ایسی بھی شخصیات گذری ہیں جو پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے----- ان کی ہجرتوں کے اسرار سے آگاہ تھے۔ دانائی کی ایسی کہانیاں آج بھی عوام میں مقبول ہیں لیکن آج ان پرندوں سے ترسیل کی کوئی سبیل نہیں رہی کیونکہ یہ ہی تو تھے جو ہواؤں کے ہر لمحہ

بدلتے رُخ کو پہنچانتے تھے۔۔۔۔۔۔یہی تو تھے جو فضاؤں کے صورت آشنا تھے۔۔۔۔ یہ آنے والے موسموں کی باس کو بہت دور سے محسوس کرلیتے تھے۔۔۔۔!یہ نئے موسموں کے مبشر بھی تھے اور مفسر بھی۔۔۔۔ لیکن پھر انسان کا ان سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ انسان نے ان کی طرف توجہ دینا چھوڑ دیا۔ ان سے اپنی وابستگی بتدریج تیاگ دی جس کے نتیجہ میں معیار و میزان کی کسوٹی بدل گئی اور مزاجوں کی ہم آہنگی دھیرے دھیرے متاثر ہوتی رہی۔ انسان بھول گیا کہ وہ خود بھی بہشت سے بچھڑا ہوا ایک موسمی پنچھی ہے جسے اُس کے خالق نے خفا ہوکر عرش سے فرش پر پھینک دیا تھا لیکن یہ پنچھی دھرتی پر صدیوں تک ارتقائی منازل طے کرتا رہا یہاں تک کہ اُس نے پر پرزے نکالنے شروع کئے اور طوفانوں کو مُسخر کرنے کا اسمِ اعظم پالیا۔۔۔۔ اب اُسے ان پرندوں سے رابطے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔۔۔۔ شاید اسی لئے میں بھی آج ان پرندوں کو اپنے حلقہ سحر میں مقید کرنے کا متحمل نہیں رہا۔ شاید میرے احساس اور میرے الفاظ کا حلقہ کشش محدود ہے۔۔۔۔! آخر میرے حواس کی شاخوں پہ چہچہانے والے یہ پرندے میرے الفاظ کی گرفت میں کیوں نہیں آتے؟ غالباً میرے الفاظ ان کے افہام کی ترسیل نہیں کر سکتے۔۔۔۔!شاید اسی لئے دھوئیں کی اس گھٹن میں سارا شہر ہی پرایا ہوگیا ہے۔۔۔۔ شاید اسی لئے کرب ناک چیخیں بُلند ہو رہی ہیں ۔۔۔۔ شاید اسی لئے مزاجوں میں سختی اور لہجوں میں کرختگی آئی ہے

---۔ شاید اسی لئے بام و در سے ایک نا خوشگوار بُو آ رہی ہے۔

---- شاید اسی لئے کمرہ مکڑیوں کے جالوں میں الجھ گیا ہے

----- نہیں ----- اب میں اور زیادہ دیر نہیں کر سکتا

-----۔ اس سے پہلے کہ خزاں کی زردیاں منظر کو لامنظر میں بدل دیں اور یہ مہاجر دوست مجھے تنہا چھوڑ دیں مجھے ان کے ہمراہ پرواز پر چلے جانا چاہئے----۔"

شناسا میزبان نے یہ کہتے ہوئے سارے الفاظ کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور موسمی پنچھیوں کے ہمراہ ابدی پرواز پر نکل گیا-----!!

☆☆☆

لالہ ٔطور

ہرموکھ کے سر بفلک پہاڑی سلسلے کی آغوش میں سمٹی ہوئی خوابیدہ بستی کو جب آفتاب کی پہلی کرن نے چھوا تو گُل کی آنکھ کھلی۔ ایک بظاہر نحیف سی کرن شکستہ جھونپڑی کے چھوٹے سے روشن دان سے چھن چھن بہتی ہوئی اُس کے چہرے پر گرمی کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ لڑکے نے ایک انگڑائی لی اور اِدھر اُدھر بکھرے مٹی کے برتنوں سے بچتا بچاتا دروازے کے پٹ کھول کر باہر آیا۔ صحن میں دیوار سے بندھی سیاہ بھینس کی آنکھیں اُسے دیکھ کر چمک اُٹھیں۔ گُل نے آگے بڑھکر بھینس کو تھپ تھپایا اور مسکراتا ہوا اُسکے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگا۔۔۔!

باہر بستی میں دوسرے ٹوٹے پھوٹے گھروندے بھی جاگ رہے تھے۔ یہ بستی شہروں سے بہت دور دیہات سے بھی آگے صنوبر کے ہرے بھرے جنگل کے دامن میں سمٹی ہوئی تھی۔ گُل کا جھونپڑا گم گشتہ بستی سے الگ تھلگ بلندی پر واقع تھا۔ یہاں وہ اپنی ماں باغاں کے ساتھ رہتا تھا۔ باغاں کا شوہر برسوں پہلے پاس کے قصبے میں مزدوری پہ گیا تھا۔ وہ مہینے

پندرھواڑے گھر آجایا کرتا تھا۔ لیکن پانچ سال پہلے کی گرمیوں میں وہ ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ کئی ماہ بعد فوج کی ایک ٹکڑی نے قصبے کے ٹھیکے دار کے پاس آکر اُس کے کپڑے دئے تھے اور کہا۔۔۔۔ یہ شخص مہینہ بھر پہلے ایک مُڑ بھیڑ کے دوران مارا گیا۔۔۔۔ پھر جب ٹھیکے دار کا کارندہ یہ خبر لیکر اُس کے پاس آیا تھا تو جیسے سارا آسمان اُسکے سر پر آکے ٹوٹ گیا تھا۔۔۔۔ تب سے ماں بیٹا اللہ کی اس کائینات میں اکیلے رہ گئے۔!

گرمیوں کے ان ایام میں باغاں صبح سویرے گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ جنگل لکڑی لانے جاتی۔ آج بھی وہ اپنا کلہاڑا لے کر صبح سویرے نکل گئی تھی۔ گُل صحن سے باہر آکر نالے کے پانی سے منہ ہاتھ دھوتا۔ آج بھی وہ اس گول چٹان پر بیٹھا نالے کے بہتے جھاگ دار دودھیا پانی کو دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر وہ دوڑتا ہوا پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ ڈھلکی اتنی عمودی نہیں تھی۔ گُل جیسے اُڑا چلا جا رہا تھا۔ اونچی اونچی گھاس کو پھلانگتا، بڑے بڑے پتھروں کے اوپر سے کودتا۔ خوش نما سُریلی آواز میں چہچہاتے پرندوں کے پیچھے دوڑتا۔ آخر وہ سبزے کے ایک وسیع وعریض مرغزار کے کنارے آکر جیسے ڈھیر ہو جاتا۔ پھر جب اس کی سانس بتدریج معمول پر آنے لگتی تو اُس کے سامنے حدِ نظر تک سبزے کے قالین بچھے نظر آتے۔ اس شاداب مرغزار پہ جنگلی پھولوں کی بہتات ہوتی۔ گُل آج بھی نہایت انہماک سے اپنے من پسند پھول چُننے بیٹھ گیا۔ گرمیوں کے ایام کے دوران یہ اُس کا معمول تھا۔ وہ سفید سفید بنفشوں کے پہلو سے اپنے مطلوبہ پھول چُن چُن کر اُنہیں اپنی پیوند لگی قمیض کے دامن میں جمع کرتا رہا۔ خوشبودار جھاڑیوں کی

اوٹ میں اُگنے والے کانٹے دار پودے اُسے ایک آنکھ نہ بھاتے۔ وہ اکثر اُن پر اپنی چھڑی کی تلوار چلاتا لیکن یہ پودے کم بخت بڑے سخت جان تھے۔ ہر دن گزرنے کے ساتھ اور زیادہ پھیلتے چلے جاتے تھے۔

گُل کو جنگلی عشق پیچاں بہت ہنس مُکھ نظر آتے۔ یہ صبح آفتاب کی شعاعوں کی ہلکی سی تپش محسوس کرتے ہی جیسے آنکھیں کھول دیتے۔ وہ دیر تک ان سفید ہلکے نیلے اور بینگنی پھولوں کے آس پاس چُپ چاپ بیٹھا رہتا۔ یہ ان رنگ برنگے پھولوں کی ہی کرامات تھی کہ یہ سنسان پہاڑ ایک حسین باغ کا سا سماں پیش کرتا ایک ایسا باغ جو دستِ فطرت نے خود اپنے ہاتھوں سے سجایا سنوارا ہو۔

گُل نے جب آنکھ کھولی تھی تو اس کی جھولی مُسکراہٹوں کے پھولوں سے نہیں بلکہ آنسوؤں کی سوغات سے تر تھی لیکن ممتا کی گھنی چھاؤں میں پروان چڑھ کر وہ ان پُر پیچ پہاڑی راستوں کے ہر موڑ اور ہر خم سے آگاہ ہو گیا تھا۔

ماں نے ہی اُسے بلندیوں پہ اونچے اونچے صنوبروں کے درمیان اس وسیع وعریض سبزہ زار سے ایک دن واقف کرایا تھا۔ یہ جگہ کتنی حسین، کس قدر شاداب اور بلند تھی یہاں نادر اقسام کے جنگلی پھول اُگتے تھے۔ پہلے دن جب اس کی ماں نے سدا بہار برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی جانب اشارہ کیا تھا تو بے چاری خود بھی بے حد جذباتی ہو گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں جیسے آنسوؤں کی جھیلوں سے منجمد ہو کر رہ گئیں۔ دراصل شادی کے بعد اُس کے شوہر نے اُسے ان وادیوں، ان پربتوں اور ان پھولوں سے نہایت والہانہ

طور آگہی دلائی تھی۔ وہ دن کس قدر خوشگوار اور یادگار تھے۔ اب کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ حقیقت نہیں بلکہ ایک خواب ہوں۔ خواب بے رحم حقیقت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ فردوسی مُحبت کے چراغ گُل ہو گئے۔ اب صرف یاد رہ گئی۔ باغاں اِن یادوں کے جاوداں جذبے کو کبھی دفن نہیں کر سکی اس گھنے جنگل کا پتا پتا اُن خلوتوں کا امین تھا۔ گرما کی وہ پُرسکون شامیں دونوں میاں بیوی ان ہی مرغزاروں میں گزارتے۔ باتیں کرتے کرتے پھر ایک دوسرے کی بانہوں میں سما جاتے اور اپنے ربّ کی عظمت کا شُکر ادا کرتے۔۔۔۔۔

لیکن اب وہ اپنے نورِ نظر کو فطرت کی ان رعنائیوں سے واقف کراتی رہتی۔ گُل کو دوڑتے دیکھ کر ممتا نہال ہو جاتی۔ پھر وہ تنہا اپنے کوٹھے میں واپس آجاتی اور گھنٹوں روتی رہتی۔ اُس کا بیٹا ماں کی روحانی اذیتوں سے دور۔۔۔۔ پھولوں اور پرندوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا رہتا اور ماں کے لئے خوشی خوشی پھول چننے لگتا۔۔۔۔۔

اُس دن بھی گُل سبزے کے مخمل پر دیر تک لیٹا رہا۔ اُس کی نظریں نیلی وسعتوں کو چھوتی ہوئی چوٹیوں پر تھیں۔ آج بھی اس کی نظریں سدا بہار برف سے ڈھکی ہوئی ہرموکھ کی چوٹیوں پر آ کر ٹھہر گیئں۔ اس چوٹی کی بلندی اِس کا جلال گُل کے ننھے سے دل پر ایک طلسمی سی کیفیت پیدا کرنے لگا۔ نہ جانے کیوں۔۔۔۔ اس منظر کی یکسانیت سے وہ کبھی اُکتا نہیں گیا۔۔۔۔۔ یہ بے نقاب جلوہ نہ جانے اُس کے کس معصوم جذبے کی تسکین کا باعث بنتا تھا وہ سانس رو کے دیر تک اسی جانب دیکھتا رہتا۔۔۔۔ جیسے یہ کوئی بے جان

منظر نہ ہو بلکہ کسی ابدی حقیقت کا پرتو ہو۔۔۔۔!

کئی دن گذر گئے۔ایک روز وہ دیر تک سویا رہا۔اس کی ماں جنگل سے لکڑی کا بڑا سا گھٹا لا کر چائے بھی بنا چکی تھی۔وہ ہڑ بڑا کر جاگ اُٹھا۔ چھوٹے سے بغیر پٹ کے روشن دان سے باہر نگاہ ڈالی جیسے آفتاب کی کرنوں سے شکایت کرنا چاہتا ہو کہ آج تمہاری ارغوانی سی لطیف دستک کیا ہوئی اُس کی ماں جب اُس کے پاس آئی تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے گُل کے چہرے کے گرد جگمگاتی چاندنی کا ہالہ سا تن گیا ہو۔۔۔۔۔خود گل روشن دان سے باہر ہرموکھ کی چوٹی پر نظریں ٹکائے تھا۔چوٹی کی جگمگاہٹ میں ہرموکھ کی سدا بہار برف کا ہر ذرہ اُسے آسمان کے ستاروں کی طرح دمکتا نظر آرہا تھا۔۔۔۔۔!

''کیا بات ہے میرے بیٹے؟ آج کیا اُوپر جا کر پھول نہیں چُننے ہیں'' ماں نے اُس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔''ماں۔۔۔۔!'' گُل کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔پھر ماں کے گلے میں باہنیں ڈال کر کہنے لگا'' ماں اگر تم مجھے راستہ دکھا دو تو آج میں بہت اُوپر چلا جاؤں گا۔۔۔۔!''

ڈری سہمی سی باغاں نے جب گُل کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا تو اُس کی نظریں آسمان کی نیلاہٹوں سے مس کرتی ہوئیں ہرموکھ کی برف پوش چوٹیوں سے ٹکرائیں۔۔۔۔۔

بے سہارا بیوہ معصوم بچے کی اس بے ساختگی پر مسکرائی۔اُس نے گُل کے سنہرے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔''یہ بھلا کیا بات ہوئی۔۔۔۔وہاں تو۔۔۔۔۔کوئی بھی نہیں جا سکتا۔۔۔۔ہاں ایک دن جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو تم اُن بلندیوں تک ضرور جا سکو گے لیکن وہاں

جا کر بیٹے تمہیں مایوسی ہوگی ۔۔۔۔ وہاں دھرا ہی کیا ہے ۔۔۔۔ جب تم وہاں جاؤ گے تو تمہیں وہاں بے پناہ ٹھنڈ اور بیکراں برف کے بغیر بھلا اور کیا ملے گا۔ وہاں نہ زندگی کے کوئی آثار نظر آئیں گے اور نہ کوئی حسین پھول ہی ملے گا ۔۔۔۔ میرے نورِ نظر! ہماری یہ جگہ تو سمجھو اس برفستان سے کہیں بہتر ہے ۔۔۔۔!" یہ کہتے کہتے باغاں ایک بار پھر گھر گرہستی کے کام میں جٹ گئی لیکن گُل اس کی ان باتوں میں غلطاں و پیچاں گُم سُم سا باہر آیا۔ نہ اُس نے کالی بھینس سے کھُسر پھُسر کی ، نہ گول پتھروں اور دودھیا پانی سے ہی محظوظ ہو سکا۔ چائے پی کر وہ اپنے ٹوٹی ہوئی ٹوکری اُٹھائے پہاڑی راستے پر چل نکلا۔ پھر جب ماں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد وہ بلندی کی آخری منزل تک پہنچا تو اُس نے اونچی اونچی گھاس میں بے ساختہ خود کو گرا دیا۔ یہ گھاس کے پودے اُس کے دیرینہ ہمراز تھے۔ وہ ان کے درمیان آرام سے لیٹ کر نیلی وسعتوں کو چھوتے ہرموکھ کو دیکھتا رہا۔ برف پوش چوٹیوں پر منعکس ہونے والی آفتاب کی کرنوں کی وجہ سے اُس کی آنکھیں پہلے پہل خیرہ ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے اُسے کچھ دکھائی بھی نہ دیا لیکن پھر آہستہ آہستہ شفاف بادلوں کے نیچے سے ہرموکھ کی دمکتی ہوئی چوٹیاں زمین کے چاند کی طرح دمکنے لگیں۔ پھر اچانک ۔۔۔۔ ان چوٹیوں کے کسی گوشے سے سرخ سرخ جنگلی گلابوں کا ایک جھنڈ سا اُبھر آیا ۔۔۔۔! اِس منظر سے گُل چونک اُٹھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور نہایت محویت سے گلابوں کے اس گلستان کو دیکھتا رہا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔

پھر اچانک وہ ایک بجلی کی طرح دوڑنے لگا۔ اُس کے لانبے سنہری

بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ اونچی اونچی گھاس پھاندتا بڑے بڑے پتھروں کے اوپر کودتا بلآخر گھر پہنچا۔ اُس نے ہانپتے ہوئے جھونپڑی کا دروازہ زور سے کھولا۔۔۔۔۔

''ماں۔۔۔۔۔۔'' وہ اپنی بے قابو سانس پہ قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ ''ماں۔۔۔۔۔۔ وہاں ہر موکھ پہ پھول اُگ آئے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ماں۔۔۔۔۔۔۔!''

بے چاری باغاں نے اُس پہ ایک معنی خیز نگاہ ڈالی۔ اس بار اس کے ہونٹوں پہ کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ ممتا شفقت کے ساگر میں ڈوبتی اُبھرتی رہی۔۔۔۔ میرا نامراد شہزادہ باپ کے سائے سے محروم میرا لاڈلا۔ میں بھی اسے مناسب توجہ کہاں دے پاتی ہوں۔ غالباً اسی محرومیت نے اس کے ذہن میں اوٹ پٹانگ خیالات کو جنم دیا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ لیکن مجھے اس کی تسلی تشفی کرنی ہوگی۔۔۔۔۔۔

''نا میرے لال۔۔۔۔ ایسی باتیں نہ ہی کیا کر۔۔۔۔!'' باغاں نے میلے دامن سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''دراصل یہ سب اس سورج کی چمک کا معجزہ ہے۔ سب نظر کا دھوکہ ہے میرے بیٹے۔۔۔۔۔ بھلا ان بھکوں سے اُوپر ان برفستانوں میں پھول کہاں سے اُگ آئیں گے۔۔۔۔!'' وہ اپنے کھردرے ہاتھوں سے اُس کے بالوں میں کنگھی کرتی رہی۔

معصوم گُل ساکت و جامد ماں کو دیکھتا رہا۔ اُس کے ذہن میں ان گنت خیالات سر اُبھار رہے تھے لیکن وہ اپنی غمزدہ ماں کو اور زیادہ دُکھی

نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔۔'' ماں۔۔۔۔۔ مجھے معاف کرنا۔۔۔۔۔''
اُس نے اُداس ہو کر کہا۔ تاہم ممتا اپنے لخت جگر کے تجسس سے قطعی غافل بھی
نہیں تھی۔۔۔۔۔'' ارے نہیں۔۔۔۔۔ تم کہتے ہو تو چلو ذرا دیکھ آئیں کہ
تمہارا یہ جنگلی پھولوں کا جھنڈ ہے کیسا؟''

ماں کی اس فراخ دلانہ پیش کش پر گُل کا چہرہ کھل اُٹھا۔ وہ نہایت
جوش و جذبے سے ماں کا ہاتھ تھامے بلندیوں کی طرف لمبے لمبے ڈگ
بھرنے لگا لیکن بہت دیر بعد جب دونوں اُن راستوں کی طرف آ نکلے تو اتنی
دیر میں چوٹیاں ایک بار پھر دبیز بادلوں کی تہوں سے گھِر گیئں تھیں۔ تمام
مناظر بادلوں کی لحاف تلے اونگھ رہے تھے سبزہ زاروں پہ دور اونچی اونچی
گھاس میں پھول جمع کرنے کی ٹوکری ان کا منہ چڑا رہی تھی۔۔۔۔!

رات کو مکئی کی روٹی باسی سبزی کے ساتھ کھانے کے بعد بھی گُل کو دیر
تک نیند نہیں آسکی۔ میلی پیوند لگی لحاف کے نیچے وہ آنکھیں کھولے کوٹھے کی
چھت کو گھورتا رہا۔ اُس کی ماں بوری کی جاءنماز پہ اللہ کے حضور روتی
گڑگڑاتی رہی، ماں کی ہچکیاں سُن کر گُل کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ پیوند لگا
شکستہ سخت تکیہ بھی اُس کے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔۔۔۔!

دوسرے دن جُمعہ کی نماز کے لئے ماں بچے کو لے کر پڑوس کے
گاؤں کے آستانے کی طرف نکلی۔ آفتاب پورے آب وتاب سے چمک رہا
تھا۔ ماں بیٹے نے دُھلے ہوئے صاف کپڑے پہن کر جونہی ڈھکی اُترنا
شروع کیا تو گُل نے ہرموکھ کی چمکتی چوٹیوں پر ایک الوداعی نگاہ ڈالتے
ہوئے ماں سے کہا۔

''کتنا اچھا ہوتا ماں! اگر ہمارے جنگل میں پھولوں کی اتنی بہتات نہ ہوتی۔ پھر شاید تھوڑے سے پھول ہرموکھ کے حصے میں بھی آتے۔ ہے ناماں۔۔۔۔!''

''توبہ کر میرے بیٹے۔'' اُس کی ماں نے سرگوشی میں کہا۔۔۔۔! ربّ جو بہتر سمجھتا ہے وہی کرتا ہے۔ بھلا ہم کون ہوتے ہیں جو اُس کے اٹل فیصلوں میں دخل اندازی کی جُرات کریں۔ یاد رکھو۔ یہ اُسی کی کریمی ہے کہ کہیں گلستان کھلتے ہیں اور کہیں ویرانے پھیل جاتے ہیں۔۔۔۔۔! تم ایسی باتیں نا ہی کیا کر۔ میرے لال''

گُل خاموش ہوگیا۔ ماں بیٹا لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلتے رہے۔ باغاں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں دعائیہ کلمات کا وِرد بھی کرتی جارہی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ گُل نے ایک بار پھر اپنی خاموشی کا لبادہ اتار پھینکا۔

''لیکن وہ ماں۔۔۔۔ وہ ہرموکھ کی چوٹی تو بہت اونچی ہے۔ نیلے آسمان سے مل کر کیا یہ جنّت میں داخل نہیں ہوتی۔ تم ہی تو کہہ رہی تھی اُس دن کہ جنّت آسمان کی اونچائی پر ہے۔ جنگل کے سارے صنوبر اسی جنّت کو چھونے کے لئے اوپر ہی اوپر بڑھتے جاتے ہیں۔ ریوڑ کے سارے بھیڑ ساری بکریاں گھاس چرتے چرتے اُسی جانب گھورتی رہتی ہیں تو کیا۔۔۔۔۔''

''نانا میرے بچے۔۔۔۔ یہ سارا دیکھنے سمجھنے کا فریب ہے۔ اگر جنّت واقعی اتنی قریب ہوتی تو تمہاری یہ ماں کب کی وہاں جا چکی ہوتی۔ اب تیز تیز قدم اُٹھاو کہیں ہم نیاز سے محروم نہ رہیں۔۔۔!''

چنار کی گھنی چھاؤں میں آستانے کی لکڑی کی بنی عمارت اِس قدر شکستہ ہوچکی تھی کہ اس کا ہر تختہ اب سیاہ رنگ اختیار کر چکا تھا۔ چنار کی نچلی شاخیں عقیدت مندوں کے باندھے رنگ برنگے دھاگوں اور کپڑوں کے ٹکڑوں سے لدی ہوئی تھیں۔ اطراف واکناف میں رہنے والوں کے لئے اس آستانے کی خاک متبرک تھی۔ باغاں نے بھی اپنے بیٹے کی سلامتی کیلئے منت مانگی۔ وہ آستانے کے باہر ایک گوشے میں درجن بھر دوسری پہاڑی عورتوں کے ساتھ نماز ادا کرتی رہی لیکن گُل ریش دراز معمر واعظ کی باتیں نہایت انہماک سے سن رہا تھا۔ کوہ طور پر نور کے ظہور کا واقعہ وہ اس قدر دلچسپی سے سن رہا تھا جیسے کہ واعظ بس اُسی سے مخاطب ہو۔ وہ جلال بھری آواز میں کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔

"۔۔۔۔۔لیکن جو دل پہاڑی چٹانوں کی طرح سخت ہو گیا ہو۔ اُس پہ ابدی نورانیت کی کوئی کرن اُجالا نہیں کرسکتی۔ چاہے ابدی حقیقت و عرفان کی کتنی بھی ضیا پاشیاں ہوں۔ چاہے برف کی فلک بوس چوٹیاں اُجلی اُجلی رحمت کی کتنی بھی تشہیریں کریں لیکن ایسے دلوں کی ظلمتیں دور نہیں ہوسکتیں۔۔۔۔!!"

واعظ نہ جانے اور کیا کیا کہتا رہا لیکن اُس کے طویل خطاب میں گُل کو بس یہ چند باتیں یاد رہ سکیں تاہم اِن باتوں نے اُسے کُچھ اور اُداس کر دیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی دونوں ندیوں میں جیسے طغیانی سی آگئی تھی۔ پاس میں بیٹھیں سیاہ بوسیدہ پیراہنوں میں لپٹی بزرگ عورتیں اُسے ناگواری سے گھور رہی تھیں۔ اُس کی ماں نے بچے کی کیفیت دیکھ کر عجلت میں نماز ختم کر دی۔ اُس

کا ہاتھ پکڑا اور آستانے کے حدود سے نکل گئی۔۔۔۔

گھر پہنچ کر وہ پھر چولہا چکی میں جُٹ گئی۔ لیکن گُل ساکت و جامد ایک گوشے میں پڑا رہا۔ شام کو وہ اُسے بمشکل چند نوالے کِھلانے میں کامیاب رہی۔ پھر وہ اُسے دیر تک بہلاتی رہی۔ اِدھر اُدھر کی بے سر پیر باتیں کرتی رہی۔ پھر کچھ مقدس لوگوں کے قصے سناتی رہی۔ گُل کا ننھا ذہن آخر تھک ہار کر نیند کی وادیوں میں کھو گیا لیکن نیند کا دامن تھامنے سے پہلے بھی اُس کا آخری خیال روئے زمین کے لوگوں ان جگہوں یا پھر ان چیزوں کے متعلق تھا جن کے لئے کہیں بھی۔۔۔۔ کبھی بھی۔۔۔۔ کوئی بھی امید کا آسمان روشن نہیں ہوتا۔۔۔۔!

دوسرے روز صبح باغاں جنگل نہیں گئی وہ گُل کے جاگنے کی منتظر رہی۔ پھر جب وہ منہ ہاتھ دھو کر چائے اور ستو پی چکا تو ماں نے نہایت شفقت بھرے لہجے میں اُسے باہر جانے سے منع کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گُل آج پھر پھول چننے جائے۔ وہ اُس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مرغزاروں میں جانے کی بجائے وہ یہیں گھر کے آس پاس کوئی نیا مشغلہ تلاش کرے لیکن لاچار ماں کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا اور آخر۔۔۔۔ مجبور ممتا کو اولاد کے زبردست شوق کے سامنے سارے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ باغاں نے ایک آہ بھر کر گویا اپنی شکست کا اعتراف کیا۔ گُل گھر کی چھوٹی موٹی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر اپنی مرغوب منزل کی طرف نکل گیا۔ نکلنے سے پہلے گو اُس نے اپنی ماں سے کوئی غیر متعلق سوال نہ کرنے کا وعدہ کیا لیکن ڈھکی کا ہر ستا سا پھر اپنے ننھے دوست کی بے نیازی پر حیران تھا۔ کیوں کہ آج

وہ ان بے جان دوستوں سے دور کسی گہرے وچار میں گُم سُم تھا۔ بے خیالی میں کئی بار اُس کے ہاتھوں سے ٹوکرا بھی گر پڑا لیکن وہ اُسے اُٹھاتا اور ہوا کے دوش پر اپنے بکھرتے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتا آگے بڑھتا رہا۔۔۔۔۔!

اُس کے ارد گرد فلک بوس پہاڑوں اور گھنے جنگلوں کا دائرہ تھا۔ اس دائرے کی پیشانی کا جھومر آفتاب کی ارغوانی کرنوں میں زیادہ رخشندگی سے چمک رہا تھا۔ دور ہرموکھ کے برفستان میں گلابی جھنڈ آج زیادہ واضح طور نظر آرہا تھا۔ اب یہ محض ایک جھنڈ نہیں تھا بلکہ اچھوتی سپید برف پر حدِ نگاہ تک رنگوں کی برسات سی امنڈ آئی تھی۔ گُل ایک مجسمہ بنا اس نظارے میں مستغرق سا ہو گیا۔ پھر اچانک ایک آواز نے اُسے چونکا دیا یہ گاؤں کے ایک ہمسایہ لڑکے کی آواز تھی جو اپنی بکریوں کو چراتے ہوئے اتنی بلندی تک آگیا تھا۔

"مام دین۔۔۔۔۔" وہ لڑکے کا نام پکارتے ہوئے اُس کے پیچھے دوڑا۔۔۔۔۔" وہ اوپر دیکھو ہرموکھ کی برف کس قدر لال لال سی لگ رہی ہے۔ مام دین۔۔۔۔۔ برف تو چٹی سفید ہوتی ہے نا۔۔۔۔ پھر یہ۔۔۔۔۔!"

چرواہا لڑکا پہلے تو ہچکچایا لیکن پھر اپنی چھوٹی سی پگڑی کا چارخانے والا کپڑا سر کے گرد لپیٹتے ہوئے کہنے لگا۔۔۔۔۔۔

'تو ایک قدم پگلا ہے۔۔۔۔۔ ارے میں نے تو اپنے بابا سے سنا ہے کہ کبھی کبھی آسمان سے لال برف بھی گرتی ہے۔ اپنے ہرموکھ بابا کا کیا ہے۔ اُسے تو اپنے آس پاس سب آلتو فالتو چیزوں کا گودام بھرتے رہنا ہے نا۔۔۔۔۔ ارے ارے میرے ڈنگر تو اُس طرف

نکلے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔!"

یہ کہتے کہتے چرواہا لڑکا اپنی بکریوں کے پیچھے بھاگ گیا لیکن اُس کی یہ نرالی تشریح سن کر بیچارہ گُل کچھ اور الجھ کے رہ گیا۔ لیکن نہ جانے کیوں اب اُس کے دل میں ماں سے استفسار کرنے کی کوئی خواہش باقی نہیں رہی تھی۔

کچھ اور دن گزر گئے۔ ہرموکھ کی چوٹیاں بتدریج گلابی دھندلکوں میں لپٹنے لگیں۔ پھر یہ دھند کی چادر مہین ہوتے ہوتے ایک دن معدوم ہوگئی۔ اب گُل کوئی سوال نہیں کرتا تھا لیکن اُس کے باطن کی گہرائیوں میں بعض سوالیہ علامات دفن ہو کے رہ گیئں تھیں۔ وہ دوپہر کی ہلکی دھوپ میں اکثر سبزے کے مرغزار کے پاس گھاس کے اونچے پودوں میں گھس جاتا اور چپ چاپ لیٹ کر شفاف بادلوں کے کھیل بہت دیر دیکھتا رہتا۔ بادل جیسے اُس کی مرضی کے مطابق مختلف روپ دھارن کرتے۔ ایک دن ایسی ہی ایک سنسان دوپہر میں اپنا یہ پسندیدہ کھیل کھیلتے ہوئے ایک اجنبی آواز نے جیسے اُس کے کانوں میں رس گھول دیا۔۔۔۔۔!

"کیوں چھوٹے میاں۔۔۔۔ کیا کر رہے ہو۔۔۔۔؟"

گُل کے سامنے جو اجنبی کھڑا تھا اُس کی وجاہت میں ایک عجیب سا اپنا پن تھا۔ برف جیسا سفید چہرہ۔۔۔۔۔ سفید لمبی داڑھی اور سفید دراز زلفیں۔۔۔۔۔ اُس کی گہری نیلی آنکھوں میں بے پناہ محبت موجیں مار رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے گُل کے اور قریب آیا۔

"میں تو بھئی، بہت دور کا سفر کرنے کے بعد بے حد تھکا ہوا ہوں۔۔۔!" یہ کہتے کہتے وہ بزرگ گُل کے پاس وہیں گھاس پہ نیم دراز ہو

گیا۔ گُل نے دیکھا کہ اُس کے نورانی چہرے اور ماتھے کی سرخیوں میں پسینے کے چند قطرے ٹپکنے کو بے قرار تھے ۔۔۔۔۔ ''ارے تم نے تو بڑے خوبصورت پھولوں سے یہ ٹوکری بھر دی ہے۔ غالباً پڑوس کے گاؤں کا بنیا خریدتا ہوگا۔ لیکن میاں ۔۔۔۔۔ تم یہ تنہا اور اتنے گُم سُم سے کیوں ہو۔۔۔۔۔۔؟''

یہ آواز اِس قدر شیریں تھی پھر اجنبی بزرگ کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اتنی مقدس، سچی اور دل نشین تھی کہ گُل جیسے سب کچھ بھول کر اس کے طلسم میں بندھ کے رہ گیا وہ اجنبی کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔۔۔۔!

''تم تو میاں بس مسکرائے جا رہے ہو۔ بات بھی کرتے ہو کیا۔۔۔؟''

اب گُل اس شفیق بزرگ کے احترام میں اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔۔۔۔ ''آپ کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے'' ''بیٹا میں واعظ ہوں۔ اپنے بعض عقیدت مندوں کے ہمراہ اِن پہاڑی علاقوں میں تبلیغ کے لئے آیا ہوں۔ لوگ مجھے شاہ پیر بابا کے نام سے پکارتے ہیں۔ لیکن تم یہاں اکیلے پڑے کیا کر رہے تھے؟''

ارے یہ تو وہی ہیں جن کا خطبہ گذشتہ روز اُس نے آستانے پہ سنا تھا۔ گُل نے بزرگ کو پہچان لیا۔ ''بابا ۔۔۔۔۔ میں یہاں کھیلتا ہوں ۔۔۔۔ بالکل اکیلا ۔۔۔۔ کیونکہ میرے ساتھ کوئی کھیلنے والا نہیں!'' گُل نے کہا۔ ''لیکن یہ تو یہاں اس اونچی اونچی گھاس میں

پڑے تم سوچ کیا رہے تھے؟''

گُل کے دل کی یک بستہ جھیل بابا کے بے ساختہ الفاظ کی شعاعوں سے جیسے پگھل کے رہ گئی۔ اُس نے شاہ پیر بابا کی آنکھوں کے نیلے آسمان میں ایک اُڑان سی بھرلی اور پھر۔۔۔۔۔ ہرموکھ کی چوٹی کی طرف اُنگلی سے اشارہ کیا۔ بابا نے اُس کی اُنگلی کی سیدھ میں دیکھا۔۔۔۔ ''ارے۔ یہ تو پہاڑ کی ایک چوٹی ہے اس کے متعلق بھلا کیا سوچنا۔۔۔۔۔؟'' واعظ اب سنبھل کر گل کو غور سے دیکھنے لگا۔۔۔۔ ''بابا۔۔۔۔۔ نہ جانے کیوں مجھے اس پر رحم آتا ہے۔ یہ اتنی دور۔۔۔۔ اتنی ویران اور اکیلی ہے۔ قدرت وہاں کوئی چیز اُگنے بھی تو نہیں دیتی۔ اِدھر ہمارے آس پاس اتنی ہریالی ہے سبزہ ہے پھول ہیں اور اُدھر۔۔۔۔۔'' گُل جذبات کی شدت سے اپنا جملہ بھی پورا نہیں کرسکا۔

شاہ پیر بابا نے گرمی کی وجہ سے ہاتھوں میں لیا ہوا سفید عمامہ ایک بار پھر اپنے سر پر رکھا اور آگے بڑھ کر لڑکے کو اپنے سینے سے لگایا۔۔۔۔

'ماشاالله۔۔۔۔۔! تم تو بڑے بوڑھوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ لیکن یہ سب باتیں تمہاری اس ننھے سے ذہن میں کس نے ڈال دی ہیں۔۔۔۔۔۔۔؟''

گُل ایک لمحہ کے لئے خود بھی حیران رہ گیا۔۔۔۔۔۔ ''میں جب بھی یہاں آتا ہوں تو نہ جانے کیوں میرا سارا دھیان اُسی جانب رہتا ہے۔۔۔۔'' لڑکے کی اس بات نے بابا کی پلکیں بھی بھگو دیں۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے پھر بابا نے ایک نئے خیال کے تحت گُل سے کہا۔۔۔۔۔۔

''بیٹے میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں ـــــ نہ تمہاری ماں اور نہ ہی تمہارا کوئی ہمسایہ وہاں برفیلی چوٹیوں میں گیا ہے۔ بھلا جو شخص وہاں خود ہی نہ گیا ہو وہ وہاں کے متعلق یقین سے کیا کہہ سکتا ہے ـــــــ؟''

''بابا ـــــ میں وہاں جانا چاہتا ہوں لیکن میری ماں مجھے جانے کی اجازت نہیں دیتی ـــــ!'' ''تمہاری ماں کا کہنا بھی صحیح ہے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ لیکن میں تم سے بڑا ہوں بوڑھا ضرور ہوں لاغر اور کمزور نہیں۔ میں وہاں جا سکتا ہوں بلکہ میں تو کہوں گا کہ خدا کی مدد سے میں وہاں جا بھی چکا ہوں ـــــ!!''

شاہ پیر بابا کے اس زبردست انکشاف پر گُل خوشی سے اُچھل پڑا۔ اُس کے معصوم ذہن میں دبے ہوئے ان گنت سوالات خوابیدگی سے بیدار ہو اُٹھے لیکن بابا اچانک کھڑے ہوئے۔ وہ اپنے کندھے پر آویزاں ایک گٹھری میں کوئی چیز ٹٹول رہے تھے۔ گُل کے کندھے پر اپنا بازو رکھ کر پھر دونوں دھیرے دھیرے ڈھلکی اُترنے لگے ـــــــــ

''میں تو کہوں گا میاں ـــــ وہ برفیلی چوٹی نہ تو اتنی ویران ہے اور نہ ہی اس قدر بے رنگ ـــــ اللہ کے کرم سے وہاں سرخ رنگ کی برف گرتی ہے۔ وہاں حدِ نظر تک یہی برف نظر آتی ہے۔ میں تو بھئی اس کے نمونے بھی جمع کرتا رہا ہوں ـــــــ!''

یہ کہتے کہتے وہ رُک گیا اور اپنے چرمی تھیلے میں سے ایک ٹین کا

چمکتا ڈبہ نکالا۔ جوں ہی بابا نے اس کا ڈھکن اُٹھایا تو ایک ثانئے کے لئے گل کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اندر ایک تیز رنگ کا مادہ سا تھا۔ گل ششدر رہ گیا۔

"بابا۔۔۔۔۔۔تو کیا یہ وہی شے ہے جو میں یہاں سے دیکھتا رہا ہوں۔ پھر تو یہ سیدھی آسمان سے گرتی ہوگی وہاں۔۔۔۔۔۔۔!"

دُنیا کی تمام اچھی چیزیں جنت سے آتی ہیں گل بیٹے۔۔۔۔۔۔! لیکن یہ چمکتی شے بھی دراصل ایک قسم کا پودا ہے۔ جیسے یہاں تمہارے ارد گرد یہ جنگلی گُلاب ہیں۔ گو یہ آسمان سے نہیں گرتے۔ تم اب تک جس برف پوش چوٹی کو ویران سمجھتے رہے ہو دراصل وہ اتنی ویران نہیں۔ اُس کی رحمت کے دروازے ہر شخص اور ہر مقام کے لئے یکساں طور کھلتے ہیں۔ اب یہ ہے کہ ہر معاملے میں نوعیت ایک جیسی نہیں رہتی۔ یاد رکھو رحمت کے دریا پہ کوئی بھی ذی حِس باندھ باندھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا!"

بابا کے ان الفاظ نے گویا گل کے کانوں میں شہد گھول دیا۔ وہ نہ جانے کب سے یہ الفاظ سننے کا متمنی رہا تھا۔ اب ساری بات کتنی سہل اور آسان ہو گئی تھی۔ چوٹی پہ دکھائی دینے والا گلابی جھنڈ کا معمہ بھی اب واضح ہوگیا تھا بابا نے ڈبہ واپس تھیلے میں رکھا اور گُل کے ساتھ قدم ملاتا ہوا اطمینان سے آگے بڑھتا رہا۔۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔۔ بہت دور شفق کی سرخیاں ہر موکھ کے سفیدیوں پر عجب تحریریں رقم کر رہی تھیں۔ نشیبی وادی اس لہو رنگ اُجالے سے مہک مہک اُٹھی تھی۔۔۔۔۔۔!

آس کا پنچھی

مخمور جنگل جو ابھی کچھ دیر پہلے تک اونگھ رہا تھا۔ اچانک خوش نوا پرندے کی مدھ ماتی صدا سے جیسے متحرک ہو گیا۔ اکتوبر کے تھکے ماندے سورج کی مضمحل کرنوں پر ایک نگاہِ غلط ڈالتے ہوئے 'بھالو' نے خشک پتوں کے بستر پر کروٹ بدلی۔ اُس کا بھاری بھرکم وجود بے جان سا لگ رہا تھا۔ تب ہی ایک بار پھر اُسی شوخ پرندے کی صدائے بازگشت سے بھالو کی خلوتیں درہم برہم ہوئیں۔ سیاہ سن رسیدہ بھالو کی نیند اب پوری طرح اُچاٹ گئی تھی۔ اُس نے جواب غور سے دیکھا تو اُسے پہاڑی ڈھلان پہ مکئی کے کھیتوں کے پاس مُرغ زرین صاف دکھائی دیا وہ کانٹے دار جھاڑیوں میں اطمینان سے اپنے دل کے رازوں کو دُنیا پہ منکشف کر رہا تھا۔!

"اچھا۔ تو یہ تم ہو۔! میرے نا تجربہ کار ہمسایہ! بڑے خوش و خرم دکھائی دیتے ہو۔ کیا اپنی ان بے معنی شوخیوں کے اظہار کا یہی وقت ملا تھا تمہیں۔! خواہ مخواہ میری اچھی بھلی نیند غارت کر کے رکھ دی نامعقول۔!"

''معاف کرنا بھالو بابا۔! مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میرے گیت سے تمہیں تکلیف ہوگی لیکن میں بھی کیا کروں۔ میرے ان گیتوں کو یہ ہوائیں اپنے ساتھ اُڑائے لے جاتی ہیں۔۔۔۔!'' مُرغ زرین کے لہجے میں شوخی کی جھلک کروٹ لے رہی تھی۔

''ہونہہ۔۔۔۔۔۔!بڑے آئے تیس مار خان۔۔۔۔! بھلا سال کے اس موسم میں تم یہ کون سا ترانہ چھیڑنے لگے ہو۔ اماں یہاں تو ہر جانور کے جان کے لالے پڑے ہیں۔ ہر ذی ہوش یا تو ہجرت کرنے کی سوچ رہا ہے یا پھر میری طرح سب کچھ بھول بھال کر بس خوابِ غفلت میں پڑا رہنا چاہتا ہے۔ میں تو صبح ہی سے ان خشک پتوں کے درمیان سر چھپا تا رہا ہوں اور یہ سوچتا رہا ہوں کہ اپنے مستقل ٹھکانے کے لئے اب کون سی جگہ مناسب رہے گی۔ ابھی میں کسی نتیجے پہ نہیں پہنچ پایا تھا کہ تمہاری اس بے ہنگم آواز نے ماحول کے سکوت کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔۔۔۔۔۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کا تو سن ہے تمہارا اور نکلے ہو گیت گانے۔۔۔۔۔! کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔۔۔۔!''

''میری خوش نوائی کی اس قدر توہین مناسب نہیں۔ اے بزرگ!'' مُرغ زرین نے نہایت انکسار سے کہا۔۔۔۔''میں سن و سال میں کم ضرور ہوں اور پہاڑی ڈھلانوں کے ان مکئی کے کھیتوں میں بود و باش کا یہ میرا پہلا سال ہے لیکن بہار اور گرمیوں کے موسم کے دوران آپ سبھی میرے گیتوں کو نہایت تحمل سے سنتے

رہے ــــــ! اب اچانک یہ گیت اتنے ناخوشگوار کیوں ہو گئے ـــــــ!"

"اے آواز کی دُنیا کے پرندے! کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھے ــــــ؟ موسم بہار میں جب ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ جنگلی پھل پک کر تیار ہونے لگتے ہیں مکئی کے بھٹے پکنے لگتے ہیں اخروٹ کی نکہتوں اور اونچے سرو کی پناہ گاہوں کے اندر تمہاری یہ چہچہاٹیں تب اچھی لگتی ہیں ــــ! لیکن آج خزاں کے ان ایام میں یہ بے وقت کی راگنی نہیں تو اور کیا ہے ــــ؟ اب نہ پھل رہے نہ مکئی کا وہ سنہرا دانہ رہا۔ اب تو چرواہے بھی اپنے میمنے لے کر نشیبی علاقوں کی طرف نکل گئے اور تو اور آج یہ پتے تک خشک اور سخت ہو گئے ہیں ــــ! میاں آج یہاں جنگل کے آس پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ اُدھر جاڑے کا بدترین زمانہ نزدیک آرہا ہے۔ جنگل کے باسی ان اندیشوں میں غلطاں و پیچاں ہیں اور ایک تم ہو جو ان تلخ ترین ایام میں ایسے بے وقت کے ترانے لئے بیٹھے ہو ــــــــ!"

بھالو نے اپنی فہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ سب کہتے کہتے اُس کے بڑے سے منہ میں جھاگ بھر آیا۔ اُس کے نتھنوں سے بھاپ سی نکل رہی تھی جب کہ اس کے نیم وا منہ سے پرانے اور پیلے دانت جھانک رہے تھے لیکن اس کے لہجے کی کرختگی سے بے نیاز مُرغ زریں نے اپنی محسوسات کا بیان جاری رکھا ـــــــ

''آپ کچھ بھی کہہ لیں بڑے میاں ۔۔۔۔۔۔! یہ گیت میرے دل کی گہرائیوں سے ابھرتے ہیں ۔۔۔۔! وہاں اب بھی سبزے کی بہتات ہے ۔۔۔۔۔! حوادث کی کوئی آندھی دل کے ان سبزہ زاروں کو خشک اور پژمردہ نہیں کرسکتی۔ ممکن ہے کہ بہار کے ارغوانی دن مجھے بھی زیادہ پسند ہوں لیکن میں بھلا پرانے موسموں کا درد کب تک اُٹھائے پھروں ۔۔۔۔۔۔؟ میں خزاں کے اس زرد اور زرخیز رنگ کا بھی یکساں طور ترجمان ہوں ۔۔۔۔۔۔! آج اگر خوراک پہلے کی سی مقدار میں دستیاب نہیں لیکن تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔۔۔۔۔۔! میں ہر حال میں شاکر ہوں ۔۔۔۔۔!''

''احمق پرندہ!'' بھاری بھرکم بھالو اب اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے سیاہ وجود سے خرخر کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں ۔۔۔۔۔۔'' ابھی تک تو تمہیں کبھی نہ کبھی کوئی کھانے کی چیز مل جاتی ہے جس سے تم اپنے پیٹ کی آگ بجھا لیتے ہو لیکن برخوردار ۔۔۔۔۔۔۔ زمستان کے برف کا طوفان عنقریب تمہارے انجر پنجر ڈھیلے کر کے رکھ دے گا۔ تب دیکھنا تمہارا تھرتھراتا بدن کیسے کیسے انوکھے نغمے چھیڑے گا۔ نامعقول ۔۔۔۔۔۔!''

''بھالو بابا ۔۔۔۔۔! اگر واقعی ایسا ہوگا بھی ۔۔۔۔۔ تب بھی اس من موجی کا کچھ نہیں بگڑتا ہے!'' مُرغِ زرین نے ایک بار پھر نہایت شوخ لہجے میں جواب دیا۔

''اس خوش فہمی میں مت رہنا نادان پرندے! برف کی منجمد کر دینے والی کُہر پوش راتیں تمہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ کرابدی نیند سُلائیں گی۔تب تم یاد کرو گے میری ان باتوں کو! فی الحال دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔خوامخواہ مجھے نیند سے جگا دیا۔۔۔۔!''

''اے پیرانہ سال وحشی جانور! اس طرح بیزاری کا اظہار مت کر۔! میں حقیر ہی سہی۔!۔تاہم گیدڑ بھبھکیوں سے لرزہ بر اندام ہونا میری فطرت نہیں ۔ میں تو ہر دن کی چھوٹی موٹی خوشیوں سے اپنی جھولی بھرنے کا قائل ہوں ۔ خیر۔ میں ایک اچھے دن کی نیک خواہشات دیکر تم سے وداع لیتا ہوں۔!''

یہ کہتے ہوئے وہ خوابوں کا پرندہ اپنے چھوٹے چھوٹے پنکھ پھیلا کر اُجالوں کے سفر پر نکل گیا۔کسی ایسی ڈال کی تلاش میں جس پر وہ غم فردا کو فراموش کر کے دل کو تسکین بخشنے والے فردوسی نغمے گنگنا سکے۔! وہ کسی نئے اُفق، کسی نئے شفق کی تلاش کے لئے اپنی جاوداں پرواز پہ نکل گیا۔!! اُدھر بوڑھا بے ڈھب بھالو اب اطمینان سے سونے کا اہتمام کرنے لگا۔اُس کا بوڑھا جھرادیو پیکر بدن جاڑے کی طویل ترین نیند کے خواب وخیال میں گم تھا لیکن مُرغ زرین کی عجب باتیں یاد کر کے اُس کی کالی پیپ بھری آنکھوں میں حیرت جھلک رہی تھی۔

سورج کی ایک گلابی کرن دُھند کی گھنی چادر سے جھانکنے لگی تو بھالو نے ہڑ بڑا کے کروٹ بدلی دھوپ کی لکیر نے جیسے اُس کی جان میں جان ڈال دی ''بڑی عجیب بات ہے'' وہ اُٹھ گیا۔''موسم ایک دم خوشگوار ہو گیا۔

ارے یہ سب نیرنگیاں تو بس چند لمحات کی ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ مہمان دھوپ رخصت ہو جائے۔ مجھے ذرا اس کی تمازت سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔!" اس بڑبڑاہٹ کے ساتھ ہی اُس نے اخروٹ کے درخت سے ٹیک لگائی اور لیٹ گیا۔

اپنی تنہائی سے مانوس و مطمین مُرغ زرین ایک دور اُفتادہ ڈال پر پرانی یادوں کے جنگل میں کھو گیا۔ یہ جگہ نہایت بُلندی پر تھی۔ یہاں وہ آرام سے اپنے مرغوب گیت گا سکتا تھا۔ یہاں اسے تنقید و تضحیک کا ہدف بنانے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنی ترنگ میں گیت گاتا رہا۔ بادلوں کی ریشمی اُنگلیاں اُسے بڑی محبت سے چھو کر گذر جاتیں۔! پھر کوئی دودھیا ابر پارہ اُسے چند لمحوں کے لئے اپنی ملائم دُھند میں لپیٹ لیتا۔ پھر جونہی شرمائی لجائی روشنی کی لکیر آہستہ آہستہ ابھر کر واضح ہونے لگی تو اچانک کہیں دور سے ایک نہایت کرخت آواز جیسے سارا رومان کافور کر کے رکھ دیتی۔ یہ کسی اور کی نہیں اُسی وحشی بھالو کی آواز ہوتی ۔۔۔! کھلی کھلی سی دھوپ مچلتی دیکھ کر مرغ زرین کا جی چاہتا کہ جا کر اُس سے کہہ دے۔ کہ دیکھ یہ خزاں میں بہار کا ساسماں کس قدر سحر انگیز لگ رہا ہے۔ اگر وہ جنگل کے اُس بدباطن سے خوف زدہ نہ ہوتا تو وہ سچ مچ ہی ابھی جا کر اُس سے یہ سب کہہ آتا۔۔۔!

بے برگ و ثمر جھاڑیوں کا گوشہ گوشہ کرنوں کے اُجالے سے مہک اُٹھا۔ مُرغ زرین مسلسل گاتا رہا۔ اُس نے جیسے بہت سی کرنیں چن کر اپنے دل کی آئینہ خانہ میں جمع کی تھیں۔ جن سے اُس کا دل جگمگا اُٹھا تھا۔ اُس کے ترانے فضا میں بہت دیر تک گونجتے رہے۔ یہ تنہا آواز تھی ۔۔۔۔۔ اس

آواز کے ساتھ آواز ملانے والے آج کوئی بھی نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ یہ خیال آتے ہی اُسے اُلجھن سی ہونے لگی۔ ابھی کل تلک تو اتنے ہم نوا تھے۔۔۔۔ ! پھر آج اتنی تنہائی، اتنا اکیلا پن کیوں! پھر جیسے اسکا صبر و قرار درہم برہم ہو کر رہ گیا ایک وہ بُلبل خوش نوا تھا لیکن آج اس کی چہچہاہٹ بھی کہیں سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اُس کا وہ بزرگانہ الاپ کل تک میری تشفی کا باعث تھا۔ لیکن آج وہ بھی عنقا ہو گیا۔۔۔ کہیں...... کہیں اس بوڑھے بھالو کی کہی ہوئی باتیں سچ تو نہیں۔۔۔۔۔!

وسوسوں اور اندیشوں میں اُس کی ذات گھِر کر رہ گئی۔ وہ بدحواسی کے عالم میں بے معنی اِدھر اُدھر پُھدکتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ "پوش نول" کے کاشانے تک اُڑان بھر کر آیا۔ پوش نول کا بدن جیسے ابھی ابھی ہلدی سے دھویا گیا تھا۔ ہلدی کی لیپ پر سیاہ حاشیوں کی ترتیب دیکھ کر مُرغ زرین بے حد خوش ہوا لیکن پوش نول چپکے سے گردن جھکائے سراپا حُزن و ملال تھا۔ جب مُرغ زرین نے اُسے بھالو کے خدشات کی بات چھیڑی تو اُس نے اپنے مخصوص ترنم میں کہا:

"اے نرالے انداز کے پرندے! ٹھیک ہی تو ہے۔۔۔۔۔۔ آخر کون سر پھِرا ہو گا جو اس خزاں کے اُداس موسم میں یوں نغمے گاتا پھرے گا۔ سچ پوچھو تو۔۔۔۔۔۔ ایک تمہارے بغیر میں نے آج تک یوں بے وقت کسی کو گاتے نہیں سُنا۔! لیکن میاں۔۔۔۔ بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟ تمہاری یہ چہچہاہٹیں اب بدلتے موسم کے مزاج سے ذرا بھی میل نہیں کھاتیں۔ آخر تم سمجھتے کیوں نہیں! ہر

ہوش پرندے کو آنے والے کل کی پیش بینی کرنی پڑتی ہے۔۔۔لیکن اُف! تمہاری اس لاعلمی نے تمہیں کتنا ضدی بنا کے رکھ دیا ہے۔۔۔۔!"

"کتنا اچھا ہوتا اگر تم نے اسے لاعلمی کی بجائے میرے صبر وقناعت سے تعبیر کیا ہوتا۔" مُرغ زرین نے اپنے پر پھڑ پھڑا کر کہا۔ "میں ہر نئے دن کے رزق کے لئے دستِ غیب کی امداد میں یقین رکھتا ہوں تم سبھی کر اس بات کا اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ آنے والا دن ابتلا لے کر آرہا ہے۔ جب کہ میرے لئے آنے والا دن اپنے تمام مثبت امکانات کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔۔۔۔!!"

مُرغ زرین نے مایوس اور بددل ہو کر واپس اُڑان بھرلی۔ اُسے علم تھا کہ اس کی محسوسات ابھی محدود ہیں۔ اُسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ جنگل کے کُہنہ سال جگادریوں کو مشاورت دینے کا متحمل نہیں ہوسکتا اُس کے پہلو میں ایک انتہائی نازک دل ہے تاہم ان کمزوریوں کے باوجود وہ سچی اور کھری بات کہنے سے بھلا کیسے چونک سکتا ہے۔۔۔۔! اپنی مدھماتی صدا سے معجزے دکھلانے والا پرندہ اپنی صغیر سنی اور نا تجربہ کاری سے آگاہ ہونے کے باوجود ٹھوکریں کھانے سے ہی مکمل ہوسکتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔!

دن گذرتے رہے۔ مہاجر مُرغابیوں کے جھنڈ دور تک پھیلی پہاڑیوں کے اوپر اب روز پرواز کرتے نظر آتے۔ اِکا دُکا چرواہے جو کسی وجہ سے ابھی تک اوپر بہکوں میں ہی رہ گئے تھے اب عجلت میں واپسی کا سفر کر رہے تھے۔ بھیڑوں اور بکروں کے میمنے اپنے ننھے ننھے مضبوط کھروں سے زمین کو

روندتے ہوئے ۔۔۔۔۔۔۔ چھلانگیں مارتے ہوئے ڈھلانیں اُتر رہے تھے ۔۔۔۔۔! میلے بادلوں کا لحاف اوڑھے بھالو اپنے اس مرغوب شکار کو دور سے بس دیکھتا رہ جاتا ۔۔۔ اُس کے خرر۔خرر۔خرر کے باوجود مُرغ زرین اپنے وہی جانے پہچانے شوخ اور شگفتہ نغمے بکھیرتا رہتا۔ لیکن اس کے نغموں کی بے ساختگی میں اب وہ پہلے جیسے مہک نہیں رہی تھی ۔ کیوں کہ خود اس کے باطن کی گہرائیوں میں انتشار کا ایک پودا بھی پنپنے لگا تھا ۔۔۔ مُرغ زرین اس پودے کا سر کچلنے کی ہر ممکن کوشش کرتا لیکن اس کے پاس ابھی جواز کی ایسی کوئی کلہاڑی نہیں تھی!

جب ہواؤں کے جھکڑ صنوبر کے جنگلوں سے چیختے ہوئے اُٹھتے اور آسمان ہلکے مٹیالے بادلوں تلے چھپ جاتا تو بے چارے کا دل دہل جاتا۔ کہنے کو تو وہ اب بھی چمکیلی سہ پہروں میں دانا دنکا ڈھونڈنے اِدھر اُدھر پُھدکتا رہتا تھا۔ لیکن پھر اچانک ہی کبھی کبھی اُس کی تیز چمکتی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو ستھرے نکھرے موتی غیر ارادی طور بہہ نکلتے ۔۔۔۔۔۔! ان آنسوؤں میں کرب و اضطراب کی ایک وسیع کائنات پنہاں ہوتی تھیں ۔ آنے والے جاڑوں کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک لرزہ خیز عفریت بار بار آ کر اُسے دہشت زدہ کر دیتا تھا ۔۔۔

اگر ملال کا یہ حال کچھ اور دن رہتا تو غالباً وہ بھی بھالو ہی کی طرح کہیں لمبی تان کے سو جاتا اور پھر ۔۔۔۔۔۔ گھاٹی کا یہ سنسان علاقہ کسی چہکار کی آواز سے محروم ہی رہتا۔ لیکن غم کی خنک اور دھیمی دھیمی آنچ کے باوجود اس کے لہو میں کیف و سرمستی کی لہریں شیتل چشموں کی طرح اُبلتیں ۔۔۔۔۔!

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔! پھر یہ لہریں دل کے ویرانے میں گلاب کے تازہ پھول کھلاتیں ! اُس دن جب سورج گھنے بادلوں سے جھانکنے لگا تو وہ جنگلی مُرغے سے دو باتیں کرنے نکل آیا۔ اس سرخ سفید سیاہ کلغی والے ملنسار پرندے کی اذان اُسے اکثر سنائی دیتی تھی اس آواز کا سوز کسی کو بھی وِجد میں میں لاسکتا تھا۔ مُرغ زرین نے جنگلی مُرغے سے سلام و دُعا کے بعد اُسے مبارک باد دی کہ وہ حوصلہ شکن اور اذیت ناک حالات میں بھی ۔۔۔۔۔ جنگل کے رہے سہے باسیوں کو خوشی اور حوصلے کی بشارت دیتا رہا ہے۔ جنگلی مُرغا یہ ساری باتیں دیر تک سنتا رہا۔ ایک اجنبی پرندے کی یہ دخل در معقولات اُسے پسند نہیں آئی تھی۔

''میرے بھولے آس کے پنچھی ! کیا تم میری بے بسی اور لاچاری کا مذاق اُڑانے آئے ہو۔۔۔۔؟ میں تو اپنی زندگی کے یہ گنتی کے ایام بس کسی طرح پورے کرر ہا ہوں ۔ ! کیا پتہ کس دن یہ زمین اور یہ شجر برف کی موٹی تہہ سے ڈھک جائیں گے اور پھر ہمیں ہفتوں کیا مہینوں تک کھانے کے ایک ایک دانے کو ترسنا پڑے گا۔ میری برادری کے جو مُرغ جنگل کی نشیبی بستی میں بھوک سے تنگ آکر غذا کی تلاش میں جاتے ہیں۔ وہ بے چارے خود انسان کی غذا بن جاتے ہیں۔۔۔۔۔!''

جنگلی مُرغے کی کھری کھری باتیں گو حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ تاہم مُرغ زرین نے احترام سے پوچھا''اے پاک باز مُرغ ! تم تو یہاں کئی موسموں سے رہتے آئے ہو۔ کیا اِن طویل ماہ و سال کے دوران تم

کبھی بھوک مری کی سی صورت حال سے دو چار ہوئے ہو۔؟''

''نہیں تو۔۔۔اگر ایسی بات ہوتی تو میں اس وقت تمہارے سامنے بھلا کہاں ہوتا'' جنگلی مُرغے نے جواب دیا'' اگر ایسی بات ہے تو تم جاڑے کے شدید ترین ایام میں بھی کسی طرح زندہ سلامت رہے ہو۔ کیوں۔۔۔؟'' مُرغ زرین اپنے استدلال پہ خود مسرور ہو اُٹھا۔ اُس کے پنکھ کچھ اور رخشندہ ہو اُٹھے۔

''مگر اے طائیر خوش نوا۔! میں نے ایسا تو نہیں کہا تھا کہ اُن ایام میں کھانے کو قطعی کچھ نہیں رہتا۔'' مُرغے نے جھنجھلا کر کہا۔'' چھوٹی موٹی چیزیں تو اِدھر اُدھر ہاتھ لگ ہی جاتی ہیں۔ لیکن یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ کل کو ممکن ہے کہ اتفاقات کی یہ کرامات نہ ہو سکے۔ پھر تو ہماری جان عذاب میں ہو گی نا۔!'' ''کس قدر نا شکری ہے یہ۔۔۔۔!'' مُرغ زرین نے اپنے نکتے کی تشریح کرتے ہوئے کہا۔'' تم اتنے سال اسی کرامات کے سہارے جیتے رہے ہو لیکن تمہارا اعتقاد اب بھی اتنا غیر پختہ ہے کہ کل کے رِزق کا خدشہ تمہیں اِس درجہ ستا رہا ہے۔۔۔!''

جنگلی مُرغا جیسے چونک اُٹھا۔۔۔۔'' اے عاقبت شناس پرندے۔۔۔۔! تم نے مجھے حیران کر دیا۔''

اس کے ساتھ ہی اُس نے پر پھڑ پھڑائے اور ایک ترانہ چھیڑتے ہوئے کسی اور جانب پُھدک گیا۔ مُرغ زرین نے خوش ہو کر ایک لمبی اُڑان لی اور واپس مکئی کے کھیتوں کے ڈھلانوں میں جھاڑیوں پہ آ کر بیٹھ گیا۔ یہیں

اُس نے عشق پیچاں کی گھنی بیل میں ایک مستور اور محفوظ آشیانہ بنایا تھا۔ یہ آشیانہ گرد و پیش کی ٹھنڈی ہواؤں اور بارش برف سے بہت حد تک بچا رہتا تھا۔ اب اُس نے کچھ دن اپنے اس نئے آشیانے کو زیادہ آرام دہ بنانے اور اپنے من پسند گیت گانے میں گزار دے۔ اُس کی شوخیاں جیسے لوٹ آئیں تھیں۔۔۔۔! وہ ایک بار پھر اپنے دل کے اہم رازوں کو ساری دُنیا پہ منکشف کر رہا تھا۔ لیکن تب ہی ایک دن اچانک۔۔۔۔ بوڑھا بھالو اُس کے آشیاں کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا۔ مُرغ زرین نے دیکھا کہ چالاک سنِ رسیدہ بھالو نے وہیں گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں جنگلی اخروٹ کے درخت کے نیچے ایک کھوہ سی کھود دی ہے۔ کھوہ کی عقب میں کچھ چھوٹے بڑے چٹان پڑے تھے۔ جن میں سے ایک کھوہ پہ جیسے سایہ کئے ہوئے تھا۔ اس چٹان پر بھی عشق پیچاں کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں سے جھڑ جھڑ کر گرنے والے زرد پتوں کی ایک بڑی تعداد کو ہوائیں کھوہ کے اندر اُڑا لے گئیں تھیں اور اس طرح زیرین خانہ جیسے ایک آرام دہ گدے کا اہتمام ہو گیا تھا۔۔۔!

"اے نوید بہار کے پیامبر! مُجھ سے یوں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔!" بھالو پہلی بار ہنسی مذاق کی سی کیفیت میں تھا۔ "آج میں بے حد خوش ہوں۔ دیکھو میں نے اپنے لئے کس قدر محفوظ آرام دہ اور شاندار مسکن تعمیر کیا ہے۔ دیکھ لو۔۔۔۔! کشادہ ہے نا۔۔۔۔۔!" زرین اپنے تساہل پسند ہمسایہ کے اس کارنامے پہ حیران رہ گیا لیکن اُس نے دل ہی دل میں اس بات کا اعتراف کیا کہ جنگلی جاڑوں کے لئے اس سے آرام دہ خواب گاہ کا تصوّر بھی نہیں

کیا جاسکتا۔" اب تم ہی بتاؤ اے ننھے پرندے۔ کون کم بخت نہیں چاہئے گا کہ برف باری کے یہ طویل ماہ و سال بس آرام سے سو کر گذارے جائیں کیوں؟ لیکن تمہاری یہ تیز آنکھیں تمہارے ننھے سے سر میں منڈلانے والے خیالات صاف ظاہر کر رہی ہیں۔۔۔! چلو مان لیا ہمارے خیالات جدا جدا ہیں اب کوئی کہاں تک تمہیں حماقتوں پہ ٹوکتا رہے۔ تم سے بھی یہی اُمید ہے کہ تم بھی یہ ٹوکنے کی زحمت نہیں اُٹھاو۔ اے مُرغ زرین اب دیکھ لو میں نے اس سال کی اپنی طویل نیند کے مکمل انتظامات کر لئے ہیں۔ اب میں عنقریب گہری نیند سو جاؤں گا اور مجھے کوئی ناخوشگوار آواز تنگ نہیں کر سکے گی!"

مُرغ زرین کو بھالو کے اس بدلے ہوئے لب و لہجہ پہ جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے بھی جواب میں اپنے ہمسایہ کو زیادہ شدت سے اپنے اشتراک کا یقین دلایا۔ لحیم شحیم بھالو کے بدن میں ننھے پرندے کی یقین دہانی سے مسّرت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ وہ بے ساختہ کہہ اُٹھا:

"میرے چھوٹے دوست! بہار کی دستک دینے کے لئے میری اِس غار کے باہر آکر اپنا حسین گیت گنگنانا۔۔۔! تب تک جنگلی پھل بھی رس دار ہو چکے ہوں گے اور چرواہے بھی اپنا ریوڑ لیکر گھاٹیوں کو بھیڑ بکریوں کی آواز سے جگا چکے ہوں گے۔ اچھا میں اب وداع لیتا ہوں۔۔۔! وہ دیکھو آسمان کو سیاہ گھنے بادلوں نے ڈھک لیا ہے۔ طوفان کا ساسماں بندھا ہوا ہے۔ تمہیں تمہاری حماقتیں مبارک! خدا نہ کرے کہ یہ تمہاری جان لے کر چھوڑیں۔! اچھا چلتا ہوں۔

الوداع۔۔۔۔!!"

بھالو اُچھلتا کودتا اپنے غار میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مرغ زرین اُسے دور تک اور دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر تیز ہواؤں کے جھکڑ نے گرد و پیش کے سارے خشک پتے اُڑا کر گویا غار کا دہانہ ہی بند کر دیا۔ اب کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ اس جگہ ایک خطرناک جنگلی جانور اپنی سرمائی خواب گاہ میں محوِ آرام ہے۔۔۔! دہانے کے بند ہوتے ہی بھالو کی کہی ہوئی باتیں صحیح ثابت ہونے لگیں۔ یخ بستہ برفیلی ہواؤں کے جھکڑ چھنگھاڑنے لگے اور آسمان نے سرمئی بادلوں کا لحاف اوڑھ لیا جیسے وہ بھی بھالو ہی کی طرح لمبی تان کر سو گیا ہو۔۔۔!

سارا جنگل بادلوں اور کہرے کی دبیز چادر تلے گُم سم کھو گیا۔ برہنہ گیلے بے برگ و ثمر درخت قابلِ رحم طور پر سر جھکائے کھڑے رہے۔ شام تک بوندا باندی ہوتی رہی لیکن صبح جب مُرغ زرین نے آنکھ کھولی تو ایک نیا منظر اُس کا منتظر تھا۔ حدِ نظر تک برف کے موٹے موٹے گالے گرتے نظر آ رہے تھے۔ سارا جنگل جیسے برف کی شفاف چادر تلے گہری نیند سویا ہوا تھا۔

اس برفیلی سحر کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی مُرغ زرین کی تقدیر کا ستارا غروب ہو گیا۔ اس کے لئے مصائب و ابتلا کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ جب آسمان میں سورج کی کرنیں ہرنیں بن کر کبھی کبھی کوند جاتی ہوں تب تک مسرتوں کے گیت گانے میں بھلا کیا مضایقہ ہے لیکن پھر جب خوشیوں کا نیلا بیکراں آسمان اتھاہ گہرائیوں میں مستغرق ہو جائے تب اُن اندھیاروں میں۔ اُن ظلمتوں میں۔ اگر کوئی گیت گائے تو اُسکے عقاید پہ

ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔!!

پھر بہت دیر بعد۔۔۔ جب برف باری تھوڑی دیر کے لئے رُک گئی تو مُرغ نے دیکھا کہ چٹانوں کے نیچے جنگلی پھلوں کے گچھے اب بھی موجود ہیں۔ان پہ اوپر ایک بھاری سِل اس طرح سایہ کئے تھی کہ برف کا ایک گالا بھی انہیں چھو نہ سکا تھا۔ پرندے نے ہمت کر کے ان سُرخ پھلوں تک پرواز کی اور پھر کچھ پھل چُگ لینے کے بعد اُس نے ثناء کا ایک ایسا ترانہ چھیڑ دیا کہ گردِو پیش میں برف کے آئینے کچھ اور جگمگا اٹھے۔۔۔۔! اُس کی گھٹی ہوئی سانس کا بے دم پرندہ برفانی ہواؤں سے جیسے سرشار ہوا۔ وہ کُھلی ہوا میں تیر کر اپنے محفوظ آشیاں میں دُبک گیا۔

زم ہریر تیز و تُند ہوائیں اب روز کا معمول تھیں۔انتشار اور بدحالی کا عجب سماں تھا۔ اُس کے اندر سے بار بار ایک اجنبی آواز اُبھرتی۔۔۔۔ 'نادان ہمزاد۔۔۔۔! تمہارے سب گیت ختم ہو چکے ہیں۔۔۔۔! تمہاری ساری آرزوئیں ڈوب گئیں ہیں۔۔۔۔! اب بھلا تمہارے آس پاس رکھا ہی کیا ہے؟ بس خواب ہی خواب۔۔۔!وُسعت نگاہ تک پھیلے یہ محض برف پارے نہیں بلکہ تمہارے بکھرے ہوئے حسین خوابوں کے ٹکرے ہیں۔۔۔۔!!''

کبھی کبھی اس آواز کی بازگشت کے دوران کہر میں سے ایک کرن سی چمک اُٹھتی اور اپنی سحر انگیز مسکراہٹ بکھیر کے کہتی۔۔۔۔ '' روشنی کبھی نہیں مرتی۔۔۔۔ لہر کبھی نہیں ڈوبتی اور گیت ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔۔۔۔!''

جنگلی پھلوں کی غذا کھانے کے بعد ثناء کے ترانے چھیڑتے رہنا اب اُس کا معمول تھا۔اب جھاڑیوں میں جو دوسرے پرندے دانے کی تلاش

میں نکل آتے تھے۔ وہ اُس کی بے وقت کی راگنی پہ اُس کا مضحکہ اُڑاتے تھے لیکن وہ طنز کے تیر سہن کرنے کا عادی تھا۔ بعض تنگ نظر پرندوں کی احمقانہ تنقید اُسے اپنے راسخ عقائد سے انحراف پہ مجبور نہیں کر سکتی تھی۔۔۔۔!

زمین اور آسمان کی ان بیکراں منجمد سفیدیوں میں وہ دیر تک سوچتا رہا۔ کُھلی آنکھ سے بہار کی آمد کے خواب دیکھتا۔ جب اضطراب اور تلاطم کی طویل رات کے بعد نئی شفق پھوٹے گی۔ نیا سویرا طلوع ہوگا لیکن پھر وہی برفانی ہوائیں تیر و نشتر بن کر اس کے نرم و نازک بدن میں پیوست ہوتیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ٹھنڈ کی شدت سے اُس کا وجود بھی منجمد ہو کر رہ جائے گا۔ اوپر گھنے جنگل کی بلندیوں میں اونچے اونچے برف پوش درخت لرزتے چیختے اور وحشت کے عالم میں کراہتے رہتے تھے۔ بہت سے درختوں کی شکستہ شاخیں برف کے بوجھ سے دب کر زمین تک جھول گئیں تھیں۔ اس حوصلہ شکن پس منظر میں وہ اپنے آشیانے کے ایک گوشے میں خاموشی سے سمٹ کر رہ جاتا۔

طویل جاڑے کے تغیّرات بھی آزمائشی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کئی ہفتوں کی برفانی آندھی ایک روز اچانک رُک گئی اور چند دن کے لئے موسم نے ایک خوشگوار سی کروٹ لی گو گرد و پیش کی زمین ابھی برف کی دبیز تہہ سے اٹی ہوئی تھی۔ لیکن کھلی فضا میں پرندوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ انہیں کھانے کو بھی آسانی سے دانہ ملنے لگا۔ پھر کہیں کہیں سے برف پگھل کر زمین کی سطح بھی نظر آنے لگی۔ مُرغ زرین اس جگہ آکر اپنی چہکار سے فسوں زدہ جنگل میں زندگی کی حرارت دوڑا دیتا پھر وہ کچھ بیجوں کا دانہ چُن کر جھوم جھوم

اُٹھتا۔ موسم کی ہلکی سی بہتری سے اُسے یہ گمان گذرنے لگا تھا کہ شاید سردیاں اب کچھ دنوں کی مہمان ہیں۔۔۔۔ وہ بھالو کی کھوہ کے چٹان پر آکر مسرت و شادمانی کے مختصر پیشگی ترانے گنگناتا۔ بے چارے معصوم پنچھی کو کیا خبر تھی کہ سب سے شدید برفانی طوفان آنا ابھی باقی ہے۔۔۔۔ اُمید کی مایوسی کا سب سے تلاطم خیز طوفان۔۔۔۔۔۔۔!

''اُف! یہ مکروہ بادل پھر منڈلانے لگے ہیں۔۔۔!'' پرندے نے ایک دن صبح سویرے اپنے گھونسلے سے باہر آکر دیکھا ''سنسان ڈھلانیں ایک بار پھر برف کا لبادہ پہنے گم سُم ہوگئیں ہیں۔ بے چارے ستم رسیدہ ننگے درخت پھر برف کے نیچے چُھپ گئے ہیں۔ ندی کا پانی بھی یخ بستہ ہوگیا ہے۔ یہ پھر کون سی اُفتاد آن پڑی ہے۔ جنگل کی مخلوق ابھی کل تک یاس کو چھوڑ کر آس کے موسم کی راہ تکنے لگے تھے۔ اے رگوں میں جم جانے والی برف۔۔۔! تمہارے منجمد کردینے والے لمس سے میرے عزم اور ایمان میں کوئی فرق نہیں آسکا۔ اب تو ان لبادوں کو ہٹاؤ۔۔۔! اب تو بھوکوں کو روزی روٹی کی تلاش میں نکل جانے دو۔ اب تو مصیبت کی ماری مخلوق پہ ترس کھاؤ۔۔۔۔۔!''

لیکن سفید سفید گول برف کے لطیف گالے۔ ناچتے ہوئے برابر گرتے رہے۔! برف باری تھی کہ رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ برف کی بے حساب تہیں بتدریج جمع ہوتی چلی گئیں۔ چاروں طرف ایک جلال انگیز سناٹا مسلط رہتا۔ سناٹا جو۔۔۔۔ مُرغ زرین کے دل کی باہر تھا اور اس کے دل

کے اندر تھا۔۔۔۔۔!وہ ہر سفید شاخ پر پُھد کتا۔۔۔۔وہ ہر پتے کو دیوانہ وار ٹھونک بجا کر دیکھتا پرکھتا لیکن اسے جنگلی پھل کا ایک دانہ بھی نہ ملتا۔۔۔۔ حواس باختگی کے عالم میں وہ بے تحاشہ پرواز کرتا رہا۔آخر مسلسل کئی دن کی دوڑ دھوپ کے بعد اُس کی محنت رنگ لائی اُسے ڈھلانوں کے نچلے علاقوں میں پہاڑی دیہات کے آس پاس ایک سدا بہار برف پوش پیڑ ملا اس پیڑ کی شاخوں میں مکئی کی فاضل گھاس گٹھری کی صورت میں رکھی تھی۔شاید کسی کسان نے سرما میں اپنے مویشیوں کے چارے کے لئے یہ گھاس محفوظ رکھی تھی۔ذرا سی تلاش کے بعد پرندے کو اس میں پکی ہوئی سرخ سرخ مکئی کے ان گنت دانے ہاتھ لگے لیکن ابھی وہ کچھ ہی دانے چُگ پایا تھا کہ کسان ایک لمبی سی چھڑی ہاتھ میں لئے پیڑ سے گھاس کا گٹھا اُتار لے گیا۔مُرغ زرین کسان کے پیچھے پیچھے اُڑتا رہا لیکن گاؤں کی پہلی ہی جھونپڑی کسان کی تھی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھاس کا بوجھ لے کر مکان میں داخل ہوا اور اپنے پیچھے لکڑی کا دروازہ دھماکے سے بند کر دیا۔مُرغ کے ہاتھ آیا ہوا خزانہ یوں اچانک چھن گیا۔وہ بید کی ٹہنی پر دیر تک بھیگی بھیگی آنکھوں سے کسان کی جھونپڑی کو گھورتا رہا۔۔۔!

''مجھے نا اُمید نہیں ہونا چاہیئے'' اُسے خیال آیا ''اب جتنے دانے میرے مقدر میں تھے وہ میں نے کھا لئے۔مجھے تو شکر ادا کرنا چاہیئے۔۔۔۔۔!''

وہ اُڑ کر واپس سدا بہار کے اُس درخت پر آ گیا جہاں یہ سوغات اُسے نصیب ہوئی تھی۔چاروں طرف سکوت کا عجیب عالم تھا۔ہوا کا ایک

جھونکا بھی نہیں چل رہا تھا۔ کہیں ایک پتہ بھی ہلتا نظر نہیں آرہا تھا۔ کہیں کوئی حرکت نہیں تھی ۔ بس کبھی کبھی کسی شاخ سے برف زمین پر گر جاتی ۔ اسی سنسان لمحے میں پرندے نے اچانک اپنا ترانہ چھیڑ دیا۔ اس ترانے کی ہر لہر میں اُس بپتا کی داستان تھی جو اس کی نحیف ذات پر آن پڑی تھی ۔۔۔۔۔! گم گشتگی کی داستان اور تنہائی کی آنچ سے سلگتے ان نغموں میں ۔۔۔۔۔ خوشی کا آہنگ اب بھی موجود تھا ۔۔۔۔۔۔! ان میں اُمید کی نوید اب بھی درخشندہ تھی ۔ آخری سانسوں تک سرگرم رہنے کا عزم اب بھی نمایاں تھا ۔۔۔۔۔! جیسے وہ محض ایک ضعیف سا بے زبان پرندہ نہ ہو بلکہ امن اور اُمید کا پیامبر ہو حالانکہ یہ دونوں ۔۔۔۔ بہت دن ہوئے ۔۔۔۔۔ عنقا ہو چکے تھے ۔۔۔۔۔!

اُس کی اپنے آشیاں تک پہنچتے پہنچتے برف باری پھر شروع ہوگئی ۔ برف کے موٹے موٹے گالے مسلسل گرتے رہے ۔ رات بھر وہ غم کی چادر اوڑھ کر سونے کی کوشش کرتا لیکن ایک نامعلوم بے قراری نے اسے ایک پل چین لینے نہیں دیا ۔ پھر برفستان کی منجمد ہواؤں نے جب کنواری صبح کا مژدہ سنایا تو وہ اپنے خیالوں میں غلطاں و پیچاں برف کے وزن سے جھکی ایک ٹہنی پر آ کر بیٹھ گیا ۔ دل گرفتہ دیر تک برف کی گرتی دیوار دیکھتا رہا ۔ تب ہی اس دیوار کو چیرتا جنگلی کوؤں کا ایک غول گزر گیا ۔ جیسے کہر پوش فضاؤں میں ایک بجلی سی کوندی اُسی لمحے پرندے کو یاد آیا کہ اُس کی اچانک اُداسی کی کیا وجہ تھی یہ سوچتے ہی جیسے کسی بے رحم شکاری کا تیر اس کے سینے میں آ کر پیوست ہو گیا ۔ اُس کے نازک تن بدن میں ایک جُھرجُھری سی دوڑ گئی ۔ اُس کی

آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا۔ یہ اُس کا خوش نوا بھائی تھا۔ جس کے متعلق اُس نے سُنا تھا کہ وہ بھی ان ہی شدید سردیوں میں ۔۔۔۔۔ اسی نوعیت کی زبردست برف بھاری میں ۔۔۔۔۔ خوشی اور مسرتوں کے گیت گاتا ہوا ۔۔۔۔۔ عظیم سکوت میں تحلیل ہو گیا تھا۔ اپنے بھائی کی یاد سے اُس کا دل تڑپ اُٹھا اور وہ گا گا کر ۔۔۔۔۔ رو رو کر اُسے آوازیں دینے لگا:

شینہ پتو پتو

بایہ پتو پتو

''اے برف! تو گرتی رہ ۔۔۔۔! اے میرے خوش نوا بھائی! تو لوٹ کے آ ۔۔۔۔۔!''

''اے کاش! میری آواز کی آنچ سے یہ کہریلی ظلمتیں چھٹ جائیں اور چمکتے محبت کے گھنیرے شجر پر میرا خوش نوا بھائی مجھے چہکتا ملے ۔۔۔۔!''

لیکن آس کے پنچھی کی سُریلی آواز کا ترانہ اکارت ہی چلا گیا۔ ٹھنڈ سے اُس کے اعضاء سن ہو کے رہ گئے تاہم نہ برف باری کی شدت میں کمی آئی اور نہ اُس کی تنہائی ہی دور ہو سکی ۔۔۔۔۔ برفیلی خنک ہواؤں میں معصوم پرندہ بہت دیر تک گیت گاتا رہا۔ اُس کے اضطراب سے جنگل کے دیودار بھی جیسے اشک بار ہو گئے چنانچہ ان پر کہیں کہیں لٹکی ہوئی برف کی قلموں سے ٹپ ٹپ قطرے ٹپکنے لگے۔ دور پہاڑوں کی بلندیوں سے برف کے دیوزار تودے لڑھک لڑھک کر پھسلتے رہے۔ ان کی پھسلن سے جو گونج پیدا

ہوئی اُس نے مُرغ زرین کے ترانے منقطع کر کے رکھ دیئے وہ پرواز کر کے اپنے گھونسلے میں آ کر دبک گیا جیسے زندہ ہی ٹھٹھرتی تاریک قبر میں دفن ہو گیا ہو۔

مکئی کے دانوں کی کشش دوسری صبح اُسے پھر کسان کی جھونپڑی تک لے گئی۔ معمول کے اپنے ایام میں وہ ان دانوں کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہ کرتا لیکن آج ان کی حیثیت کسی نعمت سے کم نہیں تھی ------!

شکستہ لکڑی پہ پھوس کی چھت والی اس جھونپڑی کے گرد وہ دیر تک طواف لگا تا رہا۔ پھر اچانک بوسیدہ کھڑکی کا ایک پٹ کُھلا اور کسی مہربان ہاتھ نے باہر پھیلے چھوٹے سے تختے پر کھانے کی کوئی چیز بکھیر دی۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکی پھر بند کر دی گئی۔ مُرغ زرین گلاب کی ملحقہ جھاڑی سے یہ سب کچھ غور سے دیکھتا رہا۔ تختے پہ بکھری کھانے کی چیز سے جو اشتہا انگیز خوشبو اُڑ رہی تھی وہ اگر چہ اُس کے لئے اجنبی تھی لیکن وہ ہر لحاظ سے کشش انگیز تھی ------ بظاہر کوئی خطرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تو کیا وہ جوکھم اُٹھا لے ------ آہ۔ بے پناہ کشش اُسے مقناطیس کی طرح کھینچ رہی تھی ------!

دوسرے ہی پل وہ تختے پر بیٹھا ہوا تھا اور نہایت جُرات مندی سے روٹی کا ایک ایک ٹکرا نگل رہا تھا اُس کا انداز ایسا تھا جیسے اُسے بڑی منت سماجت کے بعد دعوت پر آنے کے لئے آمادہ کیا گیا ہو۔ اندر کمرے سے پُر مسرت قہقہوں اور کسی نوعمر کی توتلی کھنکتی آوازیں آ رہی تھیں۔ لیکن وہ ان سے بے نیاز پُر تکلف دعوت کے مزے لوٹ رہا تھا۔ پھر جب وہ سیر ہو کر گلاب کی ملحقہ جھاڑی پر پُھدک کر آیا تو کہیں دور سے بچے کی اوئیں اوئیں کی

آوازیں آنے لگیں۔ دراصل یہ سبھی بچے ہنستے ہنساتے چیتھڑوں میں لپٹے اپنے باپ کو دیکھ رہے تھے جو برف کے بیلچے چھت سے آگے دھکیل رہا تھا۔ برف کا پہلا تودا جب ایک دھڑام سے نیچے گر آیا تو بچے خوشی سے چلا اُٹھے۔۔۔۔۔۔!

اور اُس رات۔۔۔۔۔ جب مُرغ اپنے گھونسلے میں داخل ہوا تو اُسے رات بھر کسان اور اُس کے کنبے کی فراخ دلی یاد آتی رہی اور دوسری صبح کسی کے جاگنے سے بہت پہلے وہ اُس طلسماتی کھڑکی کے باہر کی تختی پر آکے بیٹھ گیا لیکن یہ کیا۔۔۔۔۔۔ نہ وہاں گھی میں بنی مکئی کی روٹی کے لذیذ ٹکڑے ہی تھے اور نہ وہ بچے۔۔۔۔۔! اُسے لگا کہ کل کی دعوت محض ایک خواب تھی۔ پھر اگر اسے حقیقت بھی مان لیا جائے تو ایسی باتیں بھلا کبھی دوہرائی جاتیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے جو گیت چھیڑا اُس میں بہار کی ساری لطافتیں سمٹ کر آگئیں۔ نہ جانے یہ اُس کے ترنّم کا نتیجہ تھا یا انسانی زندگی کے نظام الاوقات کا تقاضہ۔۔۔۔ چنانچہ کچھ ہی دیر بعد پھر اُسی مہربان ہاتھ نے باہر تختے پر روٹی کے ٹکڑے پھیلا کر کھڑکی بند کردی۔

مُرغ زرین کو جیسے اپنے آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے ایک ایک دانہ چُگنے لگا خوب سیر ہونے کے بعد وہ جھونپڑی سے ملحقہ گلاب کی جھاڑی پر آکر بہار کی آمد کے گیت گاتا رہا۔۔۔۔!

اس نئے معمول نے اب ہر ٹھٹھری صبح کو شاداب رنگ بنا دیا تھا۔ روز کا دانہ چُگنے کے بعد جب وہ گلاب کی جھاڑی پر چہچہانے لگتا تو جھونپڑی کے اندر سے ہنستے ہنساتے بچے جیسے اُس کی آواز سے آواز ملاتے۔۔۔۔۔

جاڑا بیت جائیگا ------ برف پگھل جائے گی اور بہار پھر لوٹ کے آئے گی ----- ! کئی ہفتے گزر گئے اب ہوا میں برفیلی خنکی کے باوجود بہار کی مہک سی آنے لگی ------ برف کے پہاڑ بتدریج پگھل کر بہنے لگے ۔ نیلگوں پہاڑوں کے چہرے سے کہرے کی دبیز تہہ دھیرے دھیرے ہٹنے لگی -------

پھر ایک دن ------ سورج کی شعاعوں سے ہری بھری وادی زمرد کی طرح جگمگا اُٹھی جنگل کی ڈھلانیں بھیڑ بکریوں کی آواز سے جاگنے لگیں ۔ مُرغ زرین بھالو کے مسکن پہ جا کے بار بار بہار کی دستک دے آتا لیکن وہ کم بخت تو گھوڑے بیچ کے سویا پڑا رہا ۔ اُسی شام ایک بار پھر آسمان گھنے بادلوں سے ڈھک گیا ۔ پھر ایسا شور محشر برپا ہوا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو ۔ رعد کی کڑک کا ایسا شور اُٹھا کہ جنگل کے ریڑھ کی ہڈی تک لرز گئی ۔ تب ہی اچانک کھوہ کے اندر سے بھالو کی جلال انگیز چنگھاڑ سنائی دی ---- ! آخر وہ بیدار ہو ہی گیا تھا ----- !

بادو باراں کا طوفان ساری رات جاری رہا ۔ صبح دُھلی دُھلی دھرتی ست رنگی دھنک میں نہا رہی تھی ۔ جنگل کے چھوٹے بڑے درخت بہار کی لمس سے مہک رہے تھے ۔ سیاہ بھالو اخروٹ کے تنے سے ٹیک لگائے چھن چھن بہتی کرنوں سے نہا رہا تھا ۔ مُرغ کو دیکھ کر وہ حیران پریشان لگ رہا تھا :

" ارے واہ ----- ! تم تو زندہ بھی ہو اور پہلے سے کہیں تگڑے بھی ----- یہ سب کیسے ہوا ۔ میرے چھوٹے دوست ؟ "

لیکن جب مُرغ زرین نے اُسے اپنے تجربات سنائے اور اپنے بعض انجانے مہربان دوستوں کا ذکر کیا تو بوڑھے بھالو کو قطعی یقین نہیں آیا۔۔۔۔ "بھئی ایسے خواب تو میں بھی دیکھتا رہا۔ مکئی کے پودوں پہ ہرے ہرے بھٹے۔۔۔۔۔۔ان بھٹوں میں دودھ بھرے دانے۔۔۔۔۔ کچی سبز نرم نرم خوبانیاں ۔۔۔۔۔۔ شہید کی بھنبھناتی مکھیاں اور اُن کا وہ چھتہ۔۔۔۔۔ اوپری چھلکے توڑتے ہوئے سنہرے اخروٹ جن کی اندر کی گری سفید اور سخت ہو چکی ہے۔۔۔۔۔۔ اور پھر وہ گیلے بھیڑوں کے اون کی بو۔۔۔۔۔۔!!"

"افسوس اے جنگل کے باسی۔۔۔۔۔۔ اون کی بو کا تمہیں خیال رہا لیکن بہار کی بو تم میں اب بھی نہیں آئی۔۔۔۔۔!" مُرغ زرین نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔۔۔۔۔ "آج بلآخر تم غار کے اندھیرے سے تو نکل آئے لیکن تمہاری فطری جہالت کی زنجیریں تمہیں اب بھی جکڑی ہوئی ہیں۔ تم محض اپنے جسم کی پکار کی تکمیل چاہتے ہو۔ لہذا میرا کوئی گیت۔۔۔۔۔۔ میرا کوئی نغمہ۔۔۔۔۔ تمہارے باطن کے اندھیروں میں اُجالا نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔۔۔!!!"

☆☆☆☆☆

عاقبت سنوار چلے

رات بھر کی موسلا دھار بارش کے بعد خوبصورت دنِ طلوع ہوا تو ایسا سماں بندھا جیسے زمین اور آسمان ابھی ابھی دھو کے پھیلا دئے گئے تھے۔ گہرے نیلے گگن تلے سبزے سے نمی کی بھاپ آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھی۔ درختوں پر چڑیوں کی چہچہاہٹ تھی، کرم کیلے کے پھیلے ہوئے پتے پر رُکا ہوا بارش کا موٹا سا قطرہ ناتواں تتلی کے شفق رنگ پروں کو چھو گیا تو گویا بے چاری کی جان ہی نکل گئی۔ رات بھر کے بادو باراں نے اُس کی حیات کا چراغ گُل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن ممتا کی ماری تیز و تند آندھیوں میں بھی اپنے چھوٹے چھوٹے انڈوں کی نگہداشت سے نہیں چوکی تھی۔ اُس نے ایک حسرت بھری نگاہ سے گرد و پیش کی شاداب فضا کا جایئزہ لیا پھر اچانک اُس کی نظر اپنے پاس ہی کرم کلے کے پتے پر رینگتے کیڑے پر پڑی۔

یہ کرم پیلا کی مادہ تھی جو پتے پر اپنی مخصوص بے ڈھنگی چال سے ٹہل رہی تھی۔ جب وہ رینگتی ہوئی تتلی کے پاس پہنچی تو تتلی نے اپنے آنسو روک کر

نہایت ضبط سے کہا۔۔۔

''میری ریشمی بہن۔۔۔! کیا تم میرے بعد میرے بچوں کو کھِلانے کا ذمہ لینے کی زحمت اٹھاؤ گی۔۔۔۔! یہ میرے چھوٹے چھوٹے انڈے ہیں۔۔۔۔بہن۔۔۔۔میں خود یہ نہیں جانتی کہ ان سے میرے بچے کب تک نکلیں گے لیکن میری سانسیں گنتی کی ہیں۔ اب ان آخری گھڑیوں میں تم سے بہتر نگہداشت کرنے والی کا بھلا۔۔۔ کہاں سے انتظام کروں گی۔۔۔۔! اے میری سبز یلی بہن۔۔۔۔ تمہیں بچوں کی غذا کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ یہ تمہاری طرح اناپ شناپ غذا کھانے کے متحمل نہیں۔ تمہیں انہیں طلوع آفتاب سے پہلے کی شبنم اور پھر دن میں مختلف اوقات پر پھولوں کا رس پلانا ہوگا۔۔۔۔۔۔! میری اچھی بہن! پہلے پہل انہیں محدود پرواز کی اجازت دینا کیونکہ میرے یہ نامُرادشہزادے ابتداء میں اپنے پنکھ پوری طرح استعمال نہیں کر سکیں گے۔۔۔۔۔! لیکن تم یوں حیرت سے مجھے کیوں گھور رہی ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم اڑنے کی صلاحیت سے محروم ہو۔ لیکن اے مہربان بہن۔! میری سانس اکھڑ رہی ہے۔ میں آخری ہچکیاں لے رہی ہوں۔۔۔۔۔! اب میں انہیں تمہاری پناہ میں چھوڑ کر جارہی ہوں۔ ایک ابدی پرواز پہ۔۔۔۔! آؤ آگے بڑھو اور چلا چلی سے پہلے میرے ان شفق رنگ پروں سے یہ احمریں دھول سمیٹ لو۔ یہ میری سوغات ہے۔۔۔۔۔! اُف۔۔۔۔۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے میں۔۔۔۔۔۔۔۔''

اس کے ساتھ ہی تتلی نے آنکھیں موند لیں اور کرم پیلا کی مادہ بُت بنی اسے گھورتی رہی۔ بے چاری دم توڑتی تتلی سے اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ وہ اتنی حسین مخلوق کی پرورش بھلا کیسے کر سکتی ہے۔۔۔۔۔۔؟! وہ دیر تک حیران و پریشان کبھی تتلی اور کبھی اُس کے ننھے سے انڈوں کو دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ پھر اس نے کرم کلے سے اُتر کر اوپر کھڑے شہتوت کے درخت سے گری کچھ پتیاں جمع کیں پھر احمریں دھول سمیٹ کر تتلی کے مُردہ تن کو ان میں سمیٹ لیا اور یوں گویا اُس کی آخری رسوم ادا کیں۔ تھک ہار کر وہ ہانپتی ہوئی ایک بار پھر کرم کلے کے پتے پر آ گئی اور تتلی کے انڈوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ جگمگاتی صُبح کے اِن۔ اندھیروں میں، کرم پیلا کی نحیف مادہ کے نازک کندھوں پر بھاری بپتا آن پڑی تھی۔۔۔۔۔!

"واہ ری قسمت! بے چاری تتلی نے بھی کیا خوب آیا ڈھونڈ نکالی۔ شاید آخری وقت میں بے چاری فہم وادارک سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ بھلا میری کیا بساط جو اس قدر برتر مخلوق کی نگہداشت کر سکوں۔ میں اندھیری گھپاؤں میں رینگنے والا ایک حقیر کیڑا۔ تتلی کے خواب و خیال سے بھی حسین بچے مجھے کیا خاطر میں لائیں گے۔ وہ کبھی بھی مجھے نظر انداز کر کے اُڑان بھر سکتے ہیں۔ میں حیران ہوں! یہ تتلی اپنی جاذبیت کے باوجود، کس قدر بھولی تھی۔ بعض لوگ اپنی بھڑک دار ملبوسات کے باوجود بھی کتنے احمق ہوتے ہیں انہوں نے اپنے پنکھوں پر سونے کا ملمع تک چڑھا رکھا ہوتا ہے۔۔۔! خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ تتلی بے چاری تو مر گئی اور اُس کے یہ انڈے کرم کلے کے

پتے پر ہی رہ گئے۔ مجھے چار و ناچار یہ فرض ادا کرنا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔!''

ریشم کے کیڑے کی مادہ کا دل بھی ریشمی تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات انڈوں کی حفاظت کرتی رہی۔ پریشانی میں وہ رات بھر اطمینان سے سو بھی نہ سکی۔ وہ ہر گھنٹے ایک انتہائی فرض شناس چوکیدار کی طرح ننھے ننھے انڈوں کے گرد گشت لگاتی رہی۔ اُسے بس ایک ہی پریشانی لاحق تھی کہ کہیں انڈوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

آخر شب کا سیاہ شامیانہ ہٹ گیا۔ تخلیق سحر میں کرم پیلا کی مادہ کو آس پاس کے پیڑ قبرستان کے کتبے کی طرح نظر آئے۔ وہ دیر تک سوچتی رہی اور پھر۔۔۔۔۔اپنے آپ ہی کے ساتھ بڑبڑاتی رہی۔۔۔۔۔'' کہتے ہیں ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ مجھے کسی عقل مند آشنا سے اس معاملے پر صلاح مشورہ کرنا چاہیے۔ میں تو ایک دم سادہ لوح ہوں بھلا جب تک میں صاحبِ ادراک ہمسایوں سے استفسار نہ کروں تب تک یہ معمہ حل کیسے ہوگا۔۔۔۔۔۔۔!''

لیکن اس میں بھی ایک مشکل تھی۔ آخر وہ مشورہ کرے تو کس سے۔۔۔۔! وہاں آس پاس کبھی کبھار ایک کھُر درے بالوں والا خوفناک کتا دندناتا پھرتا ہے،۔ کم بخت کے طور طریقوں میں ہمیشہ تشدد سا جھلکتا ہے۔ اگر کبھی غلطی سے اُسے پاس بُلایا گیا تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنی شوخ دُم کو لہرا کر سبھی انڈوں کو توڑ ڈالے۔ نہیں، اُس کے متعلق تو سوچنا بھی غلط ہوگا۔ ایک بلی بھی وہیں پڑوس میں رہتی تھی۔ وہ دن میں ایک دو بار شہتوت کے نیچے آکر دھوپ سینکتی رہتی۔ لیکن وہ ایک دم سرد مہر تھی۔ کوئی جئے یا مرے اُس

کی بھلا سے۔۔۔۔!ایسی مخلوق بھلا تتلی کے انڈوں کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا کیوں کرے گی۔ کرم پیلا کی مادہ سوچتے سوچتے پریشان ہوگئی۔

''میں حیران ہوں آخر۔ اتنی بڑی برادری میں کس کی ذات پر تکیہ کروں کون ہے جو مجھے سچا مشورہ دے سکتا ہے۔۔۔۔۔؟''

اچانک فضا کسی پرندے کے ترنم سے مہک اُٹھی۔ کرم پیلا کی مادہ نے جو دیکھا تو شہتوت کی نچلی ڈال پر اُسے شاہین نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ جیسے اُچھل پڑی۔ ارے۔۔۔۔ اُسے پہلے اِس جانور کا خیال کیوں نہ آیا۔ وہ خود کو بُرا بھلا کہنے لگی۔ یہ پرندہ نیلے آسمان کی وسعتوں میں محو پرواز رہتا ہے۔ دُنیا کی اِس شورش گاہ سے دور کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ اس کا آشیاں بھی آسمان میں ہی ہوگا۔۔۔۔!اس کی پرواز کس قدر بلند ہے۔۔۔۔۔ اس کی منزلیں کتنی رفعتوں پہ ہے۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں کتنی بصیرت ہے۔۔۔۔؟ میں غالباً اسی کی تلاش میں تھی۔ اسی کی فہم و فراست سے یہ مُعمہ حل ہوسکتا ہے۔۔۔۔!

شہتوت کی شاخ کے عارضی نشمین تک ''بھونرا'' کرم پیلا کی مادہ کا پیغام لے آیا۔ پیغام پہنچانے کے بعد بھونرا ایک بار پھر نرگس کے پھول پر منڈلانے لگا۔ لیکن کرم پیلا کی مادہ بے تابی سے شاہین کا انتظار کرنے لگی۔ بلآخر اُس کی نوائے شوق کا طلسم تھم گیا اور پرندوں کی دُنیا کا دُرویش اپنی پرانی شناسا کے پاس آگیا۔ اُس کی طلسمی صُحبت محسوس کرتے ہی بے چاری مادہ نے ایک ہی سانس میں اپنی ساری رام کہانی سُنا دی اور پھر نہایت

اشتیاق سے اُسکی صلاح طلب کی۔

''اگلی بار جب تم اپنی آسمانی پرواز پر جاؤ گے۔اے فلک کے سیلانی۔تو وہاں تمہیں میری اس اُلجھن کا کوئی معقول حل سجھائی دے گا۔میں تمہاری اُس تجویز کی منتظر رہوں گی!''

شاہین کی نگاہوں میں غضب کی ملکوتی چمک تھی۔وہ دیر تک مادہ کی باتوں پر غور و فکر کرتا رہا۔پھر اُس نے کہا۔''میں کوشش کروں گا۔اے ممتا کی ماری مادہ۔۔۔۔۔۔!''

یہ نامکمل سی تشفی دیکر شاہین نے اپنے ارغوانی شہپر پھڑ پھڑائے اور آسمان کی بیکراں نیلی وسعتوں کی طرف اڑان بھر لی۔پھر جیسے وہ ان وسعتوں میں تحلیل ہو کر کھو گیا۔کرِم پیلا کی مادہ نے اُسے دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کہیں ہوتا تو نظر آتا۔۔۔۔۔۔!

نئے دن کی تمام آہٹیں اور رنگ کرم پیلا کی مادہ کے دل میں شبنم کی طرح جذب ہو کے رہ گئے۔وہ دبے پاؤں اُٹھی اور انڈوں کو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ کر نیچے چلی آئی۔نم گھاس سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔شب بھر کی جاگی بھلا گل گشت کیا کرتی نرم بھینی بھینی گھاس پہ رینگتی وہ مسلسل ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی۔۔۔۔۔۔''جانے کب آئے گا وہ میرا مہربان آزاد پرندہ۔۔۔۔غالباً اِس بار وہ حد پرواز سے بھی کہیں دور نکل گیا۔نہ جانے کہاں تک۔؟ نیلے آسمان کی عمیق گہرائیوں میں بھلا وہ کیسی آواز سنتا ہوگا اپنے بے پناہ دور کاشانے میں جاتے ہوئے اور اس روئے زمین کی طرف لوٹتے وقت وہ ہر بار کچھ دلفریب ترانے گاتا رہتا ہے۔ان ترانوں کا ایک

لفظ بھی مجھ گنوار کے پلے نہیں پڑتا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں۔ میں اس سحر انگیز آواز کے ترنم میں کھو جاتی ہوں۔ کبھی اگر اُس سے پوچھنے کی ہمت کی تو اس نے مستور موسموں کی نوید سنانے سے احتراز کیا۔!

کرم پیلا کی مادم تتلی کے انڈوں کے گرد ابھی دوسرا ہی چکر لگا پائی تھی کہ اُسے دور کہیں شاہین کے اُسی مانوس ترانے کی آواز سنائی دی۔ مادہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آکاش کا بھٹکا سنیاسی لہراتا پھڑ پھڑاتا کرم کیلے کے پھیلے ہوئے پتے کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ اُس کے تن بدن سے اُمنڈنے والی خوشبوئیں رینگتی بے ڈھنگی مادہ کی روح میں تحلیل ہونے لگیں۔

''اے ممتا کی ماری مادہ۔ خوش ہو جا۔ میں تمہاری درخشندگی کی بشارت لے آیا ہوں لیکن اپنے اعتقاد کی جگنوؤں کو کسی حالت میں بجھنے نہیں دینا۔!''

''یہ تم کیا کہتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری ہر بات کو پتھر کی لکیر تصوّر کرتی ہوں!''

''تو پھر سُن لو۔۔۔۔۔۔پہلی بات جو تم نے مُجھ سے پوچھی تھی کہ تتلی کے نوزائیدہ بچے کونسی غذا کھائیں گے۔ اے گھپاؤں میں سمٹی مادہ۔۔۔! تمہارے خیال میں یہ غذا کیا ہو سکتی ہے۔۔۔۔؟''

شاہین کی آنکھوں میں شوخیاں مچل رہی تھیں۔

''اور لو۔۔۔۔۔ بھلا شبنم اور پھولوں کی عطر کے بغیر اور کیا غذا ہو سکتی ہے۔۔۔۔!''

''ارے نہیں۔۔۔۔اس سے بھی سادہ چیز ہے وہ! ایسی چیز جس کا تم

آسانی سے اہتمام کرسکتی ہو۔۔۔!"

"اے آسمانی گیت گانے والے پرندے! تمہیں مذاق سوجھا ہے۔ بھلا میری حقیر ذات کرم کلے کے پتوں کے بغیر اور کیا پیش کر سکتی ہے۔۔۔۔!"

"واہ۔۔۔۔تم نے تو نہایت آسانی سے اُس چیز کا نام لیا۔ سچ مچ یہی پتّے ان بچوں کا من بھاتا کھاجا ہوں گے۔۔۔!"

"نہیں۔۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔۔۔۔" کرم پیلے کے سبز وجود میں ایک تھرتھری سی دوڑ گئی۔ اس نے پہلی بار طیش میں آکر کہا۔۔۔ "تتلی نے آخری ہچکی لینے سے قبل اسی بات کی تلقین کی تھی کہ میں اُس کے بچوں کو ایسی اناپ شناپ چیزیں نہ کھلاؤں۔۔۔!"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ بے چاری تتلی کو ان چیزوں کی پیش بینی حاصل نہیں تھی۔ لیکن مجھے بار بار دوہرانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم جیسے لوگ پہلے سچا مشورہ سننے کو مضطرب رہتے ہیں اور پھر سچی بات سُننے کی تاب نہیں رکھتے۔۔۔۔!"

"نہیں میرے غم خوار پرندے۔۔۔ میں تمہاری ہر بات پہ یقین کر لیتی ہوں۔۔۔۔!"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اے ریشم کے کیڑے کی مادہ۔۔۔۔! تم تو میری اتنی سی بات پر اعتبار نہیں کرسکیں۔ میں تو تم سے کچھ اور ہی اہم باتیں کہنے آیا تھا۔ اب کیا کروں۔۔۔؟ مجھے تو تمہاری حالت پہ ترس آتا ہے۔ اچھا چلو یہ بتادو کہ تتلی کے ان انڈوں سے کیا نکلنے

والا ہے۔۔۔۔۔؟"

"اور سنو۔۔۔" کرم پیلا کی مادہ نے اپنی مخنی تن کے درمیانی حصے کو بلند کرتے ہوئے کہا۔ "تِتلیاں میاں۔ اور بھلا ان سے کیا نکلے گا۔!"

شاہین نے اپنی مخاطب کی سادہ لوحی پہ اپنے خوب صورت پر پھڑ پھڑائے۔۔۔ "میری بات تحمل سے سنو۔ ان انڈوں سے تتلیاں نہیں۔۔۔ ریشم کے کیڑے نکلیں گے۔ بالکل تمہاری طرح کے رینگنے والے۔۔۔۔!!"

یہ اہم انکشاف کرتے ہی شاہین نے ایک لمبی اُڑان بھر لی کیونکہ وہ اس بظاہر ناقابل یقین بات پر اپنی دیرینہ واقف کار سے بے معنی بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اُدھر کرم پیلا کی مادہ حیران و پریشان رہ گئی۔۔۔۔ "افسوس۔ میں پرندوں کی دنیا میں اسے سب سے زیادہ دانش مند سمجھتی تھی لیکن یہ کیسی احمقانہ باتیں کر کے گیا ہے۔ کتنی عجب بات ہے کہ جو لوگ اتنے اونچا اُڑتے ہیں۔ اُن کے خیالات اتنے پست ہوتے ہیں۔۔۔!"

سحر زدہ مادہ انڈوں کے گرد چکر لگاتی رہی۔ باہر پرندے سر شام سر چُھپا رہے تھے۔ تب ہی البیلا شاہین اچانک پھر ظاہر ہوا۔ اُس کے بدن پر جیسے چاندی کا لباس تھا۔۔۔ "اے ریشمی کیڑے۔۔۔۔ سب سے اہم بات میں تمہیں سنا نہیں پایا۔ پس جان لو کہ ایک دن تم

خود۔۔۔تتلی بن جاؤ گی۔۔۔!!!" کرم پیلا کی مادہ اب ضبط نہ کر سکی۔۔۔"بد بخت پرندے۔تم پہ اللہ کی مار۔تم نے مجھ ستم رسیدہ مخلوق کا مذاق اُڑایا ہے۔تم احمق ہی نہیں ظالم بھی ہو۔چلے جاؤ۔اب مجھے تمہارے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"اے بھولی مادہ۔۔۔۔!تم نے سرِ شام اپنے اعتقاد کے جگنو بُجھا دیئے ہیں۔۔۔!تمہاری شب ظلمت اب کیونکر کٹے گی؟ لیکن یاد رکھو میں سرابوں کا سفیر نہیں ہوں۔میں توافق کے پار کی سیماؤں میں جا کر عجیب وغریب چیزیں دیکھتا ہوں۔لیکن میں اپنے اندر اعتماد کے آفتاب کو کبھی بجھنے نہیں دیتا۔۔۔رہی تمہاری بات تم چونکہ صرف رینگ سکتی ہو اور کرم کلے کے اس پتے سے باہر کی دنیا دیکھنے کی متحمل نہیں ہو لہذا تمہیں ہر نئی چیز انہونی اور نا قابلِ فہم لگتی ہے۔۔۔!" شاہین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم مجھے بیوقوف سمجھتے ہو۔۔۔کہاں میرا یہ لانبا نحیف سبز بدن اور ان گنت ٹانگیں اور کہاں تتلی کی رنگینیاں اور ان کے پر۔۔۔!"

"اپنے خول میں سمٹی ہوئی سادہ لوح مادہ!نا سمجھ دراصل ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بعض ایسی باتوں کا جواز تلاش کرنے کی ناممکن کوشش کرتے ہیں جو اُن کی فہم وفراست سے بالاتر ہوتی ہیں۔اس جہانِ رنگ وبو میں تمہیں جو سوغات ملتی ہے اُسے بڑھ کر اپنے آنچل میں سمیٹ لو۔۔۔میں یہی کرتا ہوں،میرا یہ اعتقاد ہی میرا سرمایہ حیات ہے۔۔۔!"

یہ کہتے ہوئے شاہین اپنے چمچماتے شہپروں کو پھڑ پھڑاتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُس کی نوائے شوق کے ترانے کرم پیلا کی مادہ کے کانوں میں دیر تک گونجتے رہے۔ پھر وہ اچانک چونک اُٹھی۔ اُس نے حیرت زدہ ہو کر ارد گرد نظریں دوڑائیں۔ ابھی ابھی جہاں تتلی کے انڈے رکھے تھے وہاں اب ریشم کے آٹھ دس کیڑے اِدھر اُدھر رینگ رہے تھے۔ انہوں نے چوس چوس کر کرم کلے کے پھیلے ہوئے پتے میں سوراخ بھی کر دیا تھا۔۔۔!

یہ منظر دیکھ کر کرم پیلا کی مادہ ششدر رہ گئی۔ پھر ساری بات اُس کی سمجھ میں آگئی۔ اُس کا دل ندامت اور شرمندگی سے شرابور ہو گیا۔ کاش وہ اپنے محسن پرندے سے اپنی معذرت کا اظہار کر سکتی۔۔۔!

اُس رات نوزائیدہ بچوں کو کھلانے کے دوران وہ اُس گھڑی کے خواب سجوتی رہی۔ جب وہ خود تتلی کے حسین پنکھ لے کر فضاؤں میں اُڑتی پھرے گی۔۔۔۔۔!

☆☆☆☆☆

ناشناس

''اے کاش ـ ـ ـ ـ ـ میں نیست نابود ہو جاؤں ـ ـ ـ ـ ـ !''

ہوا نے زمین کے گرد اپنا گشت مکمل کیا تو اُس کی سرسراہٹ میں چُھپے درد سے سربہ فلک کوہسار اور آسمان سے باتیں کرتی ہوئیں چوٹیاں بھی تھرا اُٹھیں۔ ہوا کی بے ساختہ پُکار سن کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے ہزاروں برس کی دبی ہوئی آہیں اور رُکے ہوئے آنسو اچانک بہہ نکلے ہوں۔

''ہاں ـ ـ ـ ـ ـ! میری ہستی اب بیکار ہے۔ اے میرے معبود! اب مجھے نابود کر، کیونکہ جسے تو نے اشرف المخلوقات بنا کر تخلیق کیا تھا۔ وہ انسان میرے لئے ایک مستقل عذاب بن گیا ہے ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ !

''یہ کیا خرافات ہے ـ ـ ـ ـ ـ؟'' وہ کوہسار اور وادیاں چلا اُٹھیں جن کی وُسعتوں میں ہوا کی فریاد بکھر رہی تھی۔ ''انسان تو اِس روئے زمین کی شان ہے۔ وہ کائنات کی آنکھ ہے۔ معبود نے اُسے لامحدود توانائیاں بخشیں۔ شاید تمہیں خالق کی اس سب سے نرالی تخلیق سے جلن ہو رہی ہے یا پھر تم اپنے فرائض سے انحراف کی مرتکب ہو کر تنقید پہ اُتر آئی ہو!''

''تم ہمہ تن گوش ہو جاؤ اور پھر اپنا فیصلہ صادر کرو۔'' ہوا زناٹے بھرتی ہوئی پکار اُٹھی ''میں انسان کی عظمت اور معبود کے جلال کے لئے ہی متفکر ہوں۔ تمہیں علم ہے کہ میری ہستی مجسم انتشار ہے۔ قرار میرا مزاج نہیں۔ میں خالق کائنات کی ہدایت کے تحت پرواز میں ہوں۔ پرواز ہی میرا جوہر ہے۔۔۔۔! لیکن شب و روز کے اس پیہم سفر کا مجھے کیا صلہ ملا ہے۔۔۔ اے مہربان زمین۔ اے سرسبز وادیو۔۔۔۔ تمہیں اپنے ہرے بھرے جنگلوں اور بہتے ہوئے دریاؤں کا واسطہ ہے۔۔۔۔! میرے ساتھ انصاف کرو۔ تم سے زیادہ اس حقیقت سے بھلا کون واقف ہے کہ میں صدیوں سے اپنے پیروں میں سبز اُڑانیں لیکر محو پرواز ہوں۔ میں کس قدر سرشاری کے عالم میں تمہارے ان پہاڑوں پہ رقصاں ہوں میں نے کس خلوص سے تمہارے گھنے جنگلوں کے نوخیز پیڑوں کو سجدوں کا سلیقہ دیا ہے۔ میں نے حسین پھولوں سے سرگوشیاں کیں اور انتہائی نفاست سے ان کی خوشبوئیں سمیٹ کر عرش کی رفعتوں تک پھیلا دیں خود خالق اپنی لامکانی کی وسعتوں میں سمٹا رہا لیکن میں نے اُس کے ارشادات کی تعظیم کی اور خود کو بکھیر کے رکھ دیا۔۔۔۔۔! یہ گردشیں میرا مقدر بنیں تاہم میں ان سے نالاں بھی نہیں ہوں۔ مجھ الم نصیب پر تو ایک اور ہی افتاد آن پڑی ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ انسان افضل ترین مخلوق ہے۔ ارض و سما کی تمام وسعتیں اُس کی دسترس میں ہیں لیکن اس حضرت انسان کی جبلت اس قدر منفرد ہے کہ یہ ہر لمحہ تسکین چاہتی ہے۔ پھر یہ جبلت بڑھکر اُسے تخریب کی ترغیب دیتی ہے۔۔۔۔! نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

وہ فطرت کا حُسنِ انتظام پراگندہ کرکے رکھ دیتا ہے تمہیں میرے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیے کہ مجھے انسان کی بسائی ہوئیں اِن بڑی بڑی صنعتی بستیوں میں ماہ سال گزارنے پڑرہے ہیں۔۔۔۔میں بارود کی بو سے تھرتھراتی ان بستیوں کو نظرانداز کرنے کی متحمل بھی نہیں۔! جدید تہذیب کے اس زہریلے دھوئیں نے میرے ارد گرد ایک قبرسی بنالی ہے۔۔۔!
مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی توہین، تحقیر اور تخریب کی یہ تلخ ہوائیں خالق تک لے جانی پڑتی ہیں اور یہ اُسی انسان کی سوغات ہے جسے اشرف المخلوقات کا نام دیا گیا ہے۔۔۔! کیا اب بھی میں اپنے معبود سے یہ شکوہ نہ کروں کہ انسان میرے لئے ایک مستقل عذاب بن گیا ہے۔ ممکن ہے کہ میرے خاتمے کے ساتھ ہی مشینی نظام کا یہ مادہ پرست کل پُرزہ بھی آخری ہچکی لینے پر مجبور ہو جائے۔۔۔۔!"

"ہم تو کہیں گے کہ پھر بھی تمہاری جان کم عذاب میں ہے۔۔۔۔!"
وادیاں اور کوہسار ہوا کے طویل دلائل سننے کے بعد تحمل اور تدبر سے کہنے لگے۔۔۔"اے ہوا۔ ہمیں یہ جان کر افسوس ہوا ہے کہ وراثت کا بوجھ تمہارے لئے اتنا گراں ثابت ہو رہا ہے۔ ہم تمہیں خیر و برکت کا سفیر تصور کرتے رہے ہیں۔ ہمیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ کوئی عنصر تمہیں آلودہ بھی کرسکتا ہے اگر ایسا صحیح بھی ہے تب بھی تمہیں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ تم اپنے بال و پر میں صرف یہی وُبال لیکر نہیں گھومتے۔ تمہاری اُڑانوں میں خدا ترس لوگوں کے کلمات بھی ہیں اپنے کھیون ہار کی شردھا میں گائے ہوئے گیت بھی ہیں۔ معصوم بچوں کی گلکاریاں اور صوفی سنتوں

کے آفاقی نغموں کے علاوہ شاعر کوی لوگوں کے دلوں کی نشاط انگیز لہریں بھی ہیں کیا روحانی سکون بخشنے والی یہ ساری چیزیں بھی تمہاری طبعیت پر بوجھ ڈالتی ہیں۔۔۔۔؟!"

"لیکن۔۔۔۔اے زمین کی زیور وادیو۔۔۔۔! بھلا اِن کی اہمیت ہی کیا ہے۔" ہوا سدا بہار صنو بروں میں سے کراہتی ہوئی نکل گئی۔۔۔۔۔" منکروں اور نفس کے بندوں کا شور و شر تو اس سے بھی ہزار گُنا زیادہ ہے۔ ارض و سما کی تمام وُسعتیں اپنے خالق کی توصیف کا ورد کر رہی ہیں لیکن افسوس ایک انسان کی ذات ہے جو صداقت سے دور نفرت کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے! وہ اپنے مالک کی عظمتوں کا اعتراف نہیں کرتی۔ بے جان مخلوق بھی اپنے پالن ہار کی اطاعت سے غافل نہیں لیکن جس انسان کو تمام مخلوقات پر ترجیح دی گئی ہے وہی سب سے زیادہ روگردان ثابت ہوا"

"عروجِ آدمِ خاکی پہ تنقید کرنے والے۔۔۔۔! تم یہ حقیقت فراموش کرتے ہو کہ انسان آزاد ہے وہ احساس ادارک کا مالک ہے۔ اُسے تحقیق و شناخت کی تمیز بخشی گئی ہے۔ وہ احساس کے نوکیلے پتھروں پر برہنہ پا چلتا ہے۔ کسی منزل کی تلاش میں۔! وہ تقلید پرست نہیں۔۔۔! وہ اپنی راہ خود متعین کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ مالک نے اُسے خیر و شر کے لامحدود امکانات کے ساتھ خلق کیا ہے۔ تمہیں خیر و شر کی اس ازلی جنگ کا نہایت تحمل سے مشاہدہ کرتے رہنا چاہئے۔ اُس دن تک۔۔۔۔ جب معبود خیر کو قبولیت بخش کر بقائے دوام نہ دے۔۔۔۔۔!!"

"اے زمین، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔!" ہوا کی آہوں سے گھنے

جنگل چیخ چیخ رہے تھے۔ ''انسان کے بلند مقام پر رشک کے جذبات بلا جواز نہیں۔۔۔۔۔ مالک نے انسان کو فانی مخلوقات میں امتیاز اور افتخار کا درجہ دیا حالانکہ تمہاری کوکھ میں ایستادہ یہ کوہسار کے سلسلے اپنی جگہ اٹل ہیں۔انہیں نسل در نسل حیات کا زہر پینا پڑتا ہے۔! لیکن انسان جو فطرت کا محبوب اور مرغوب ہے ایک سائے کی طرح گزر جاتا ہے۔ وہ اگتا ہے اور گھاس کے تنکے کی طرح کٹ کر گر جاتا ہے۔ اُس کی ڈوبتی سانسوں کا بارِ گراں، میری روح میں صدیوں سے تحلیل ہوتا رہا ہے چنانچہ آج میرا ہر جھونکا ان سے بوجھل ہے کیونکہ یہ زہریلی آلودگیاں میرے رگ و ریشے میں رچ بس گئیں ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے خود اپنے وجود سے بھی کراہت ہونے لگتی ہے۔ اسی لئے میں اپنے معبود سے معدوم ہونے کی التجا کرتی ہوں تاکہ بزمِ کائنات کا یہ زہر پینے سے محفوظ رہ سکوں۔۔۔۔!''

ہوا کی اس بات پر برفیلی چوٹیوں کے سفیدیاں مسکرائیں۔ ''تم صحیح فیصلہ کرنے کے متحمل نہیں اے ہوا۔ تمہارا تجزیہ یک طرفہ ہے۔ مثلاً کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ انسان کی جو آخری سانسیں تمہارے سینے میں سما جاتی ہیں وہ دراصل خاک کے قفس سے ایک ایسے پنچھی کو آزاد کر رہی ہوں جس کا وجود خود تمہاری ہستی سے زیادہ بیکراں اور جاوداں ہو۔! ذاتِ مطلق کا یہ جوہر تم سے بھی زیادہ حسین اور لطیف ہوسکتا ہے۔ دراصل ہمارا معبود بہترین حکیم و علیم ہے لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تمہیں اس کے انصاف میں اعتماد نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ گوشت و پوست کے ایک بے حس تودے پر تم نالاں ہو رہے ہو۔۔۔ بیکراں آسماں میں جاوداں پنچھی کی پہلی پرواز

تمہارے لئے بارِ گراں بن رہی ہے۔۔۔! اے ہوا۔۔۔! موت کی اس طرح لعن وطعن کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ تم حقیقت شناس ہو کر بھی ناشناس مت بنو۔ تمہیں اتنا تو معلوم ہے کہ یہ سب کچھ اُسی خالق کی نغمہ سرائی ہے۔۔۔۔! چنانچہ وہ جب چاہے جاوداں زندگی کا ساز چھیڑتا ہے اور جب چاہے زندگی کے ساز سُروں کا شیرازہ مُنتشر کر دیتا ہے۔۔۔!"

لیکن ہوا کی اُلجھن بتدریج بڑھتی رہی۔ اُس کے مجسم انتشارِ وجود میں تھرتھراہٹیں پھیلتی رہیں۔ ! خدشات اور وسوسوں نے اُس کے اطراف واکناف میں گھیرا کر لیا تھا۔ "لیکن اے جلیل القدر زمین۔ ایک بات میری بھی سنو اور پھر فیصلہ کر لو۔۔۔ صرف آنکھیں موندنے والے انسان کی آخری ہچکی میرے پیہم عذاب کا باعث نہیں صرف اس کی تھکی تھکی سانسیں ہی میرے جی کا جنجال نہیں ہیں۔ جو لوگ زندہ ہیں اُن کی سانسوں کی آلودگی تو اس سے کہیں زیادہ اذیت ناک عذاب ہے۔ انسان مسلسل غموں اور دکھوں کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔۔۔ اس کے شام وسحر اشک بار ہیں۔ بیماریوں اور مصایب کے آگے وہ لاچار اور بے بس ہے۔ اُس کے درد تکلیف کی آہیں مجھ میں سمانے کو بے قرار رہتی ہیں۔ اُدھر مظلوم اور جبر کی چکی میں پسنے والے لوگوں کی پکار میرے آس پاس گونجتی رہتی ہے۔ جب شکستہ بستیوں میں آہوں کا دھواں گھنا ہو جاتا ہے تو میں۔۔۔ رات کی جھیل کے پار کسی پُرسطوت محل کے ایوانوں کا طواف کرتی ہوں۔ کبھی محاذ جنگ پہ خاک اور خون میں لیٹی لاشوں کو

بارود کے دھوئیں میں جھلستا چھوڑ کر دور کسی خانقاہ کی عافیت میں پناہ لیتی ہوں لیکن یقین جانو انسان کی آہ و زاریاں کہیں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اشرف المخلوقات کے قدم جہاں بھی پڑتے ہیں وہاں آہوں اور آنسوؤں سے اُکھڑیں اُکھڑیں سانسیں میرا مقدر بن جاتی ہیں۔ اب میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ زندگی برداشت نہیں ہوتی اس لئے معبود سے التجا ہے کہ وہ کسی طرح اس پیہم عذاب سے مجھے نجات دِلائے۔۔۔۔۔!"

"اے زیرک اور مُضطرب ہوا، ایک ذرا تحمل سے کام لو۔۔۔ تم انسان کے نہاں خانوں میں مستور اسرار سے آگاہ نہیں۔۔۔۔۔! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آلام کی ان آہوں کے درمیاں انسان کے دل کی عمیق گہرائیوں سے توبہ اور استغفار کے کلمات بھی نکلتے ہوں کیا اس دنیا کے وقتی غم سے دوسری دُنیا کی جاوداں خوشیاں بہتر نہیں۔؟ کیا ایک سچے مخلوق کی دُنیاوی تکلیف سے اعتقاد کے گیتوں کی تاثیر اور تعظیم بڑھ نہیں جاتی۔

اے ہوا۔۔۔! بے پناہ اذیت و ابتلا کے بعد حاصل ہونے والے پھل کا اندازہ لگانا تمہارے لئے مشکل ہی نہیں لگ بھگ ناممکن ہے۔۔۔!"

لیکن ہوا زمین کی جمالیاتی خود فراموشی کی لطیف کیفیت سے ذرا بھی مسحور ہوئے بغیر چنگھاڑتی اُڑتی رہی۔۔۔۔۔۔ "اگر تمہاری بات تسلیم کی جائے تو کیا انسان اس روئے زمین کی سب سے نامراد مخلوق ہے۔

کیونکہ صرف اِسی تیرہ نصیب کو اذیت کے بدلے خوشیاں خریدنی پڑتی ہیں ۔کیوں۔۔۔۔!"

"تمہارا المیہ یہ ہے کہ تم انسان کی آہوں کا حساب تو رکھتی ہو لیکن تمہیں اس انسان کی روزِ روشن کی طرح عیاں سادہ اور صاف خوشیاں نظر نہیں آتیں۔۔۔ ہزاروں لاکھوں صحت مند توانا اور باعزم انسانوں کے سانسوں کی مہک تمہارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔۔۔۔! کاش تم محبتوں اور اُمنگوں کی ان اُجلی شفاف آوازوں پر بھی کان دھرنے کی زحمت اُٹھاتی۔۔۔۔۔! کاش۔تم فرشتوں کی فضیلت سے سرشار ننھے بچوں کی گلکاریوں کی طرف بھی توجہ دیتی۔۔۔۔۔!اے ہوا۔۔۔ ممکن ہے کہ تم آسمان کے تاروں کی گنتی کر سکو لیکن زمین کی گود میں سمٹی ہوئی خوشیوں کا شُمار کرنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔۔۔۔۔!ایسے محتسب لائق افسوس ہیں جو اس بیکراں زندگی کا تجزیہ صرف چند چونکا دینے والے واقعات کی کسوٹی پر کرتے ہیں۔ دراصل ایسے عناصر زندگی کا مجموعی تجزیہ کرنے کے اہل ہی نہیں ہوتے۔۔۔۔۔!"

"اے برف پوش لباس میں ملبوس پہاڑو اور وادیو۔۔۔میری پوری بات سُن لو اور پھر اپنا فتویٰ سناؤ۔۔۔! انسان ازلی گناہ سے مردود اور مقہور ہے۔ وہ نفس کی پستیوں میں مستغرق ہو کر مکروہ سے مکروہ ترین کام کر گزرتا ہے، شناسائی کا زہر میرے رگ و پے میں ہے۔ گناہ کے مذموم الفاظ، بدترین ہوس پرستی کی سرگوشیاں ریاکاروں کا مکر و فریب۔۔۔۔۔ بے راہ روی کے خطبات۔ بے حیائی اور فحاشی کے گیت۔اُف! آج میں ان

سبھی آلودگیوں کا مجموعہ اور ان کا امین ہوں ۔۔۔۔! کیوں ۔۔۔۔؟ آخر میں ہی ان مکروہات کی انت دار کیوں ۔ آخر کیوں ۔۔۔۔؟!"

"تم کیا تم اپنے معبود کے عدل اور اُس کی حکمت سے مُنحرف ہو؟ اے ہوا۔ خود کو یوں گمراہ نہ ہونے دے! توازن اور اعتدال اپنا مزاج رکھ اور خیر و شر کا زیادہ معقولیت سے محاسبہ کر۔ یاد رکھ۔ جب تک عبادت اور ریاضت کی مہکتی صدائیں تمہارے سینے میں سماتی رہیں گے۔ اُس وقت تک ہوّس پرستی کے الفاظ تمہیں آلودہ کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جب تک پاک اور مطہر افکار و اعمال کی لہریں تم سے ہم آہنگ ہوتی رہیں گی ۔۔۔۔! جب تک ایمان اور اعتقاد کی آواز گونجتی رہے گی تب تک آہوں کا دھواں ہمیشہ تحلیل ہوتا رہے گا ۔۔۔۔ جب تک بالیدہ لوگوں کی روحیں عرش کا تک سفر کرتی رہیں گی تب تک تمہارے قلب و روح کی تازگی شاداب ہوتی رہے گی ۔۔۔ لہذا اے ہوا ۔۔! شانِ کریمی سے بدگمانی کی مرتکب نہ ٹھہر اور صبر و شکر سے اپنا فرضِ منصبی انجام دیتی رہ ۔۔۔!"

"لیکن اے زمین ۔۔۔ اے کوہ و بیابان ۔۔۔۔ کیا کبھی وہ صُبح بھی آئے گی ۔۔۔۔! جب سچ اور جھوٹ کے موجودہ معیار و میزاں بدل جائیں گے ۔۔۔! جب انسان کی سیاہ کاریوں کے ابواب بند ہو جائیں گے ۔۔۔۔! ابھی تک تو وہ کتّے سے بھی زیادہ شہوت پرست لومڑی سے بھی زیادہ مکار ۔۔۔ شیر سے بھی زیادہ خون خوار ۔۔۔۔ گدھے سے بھی زیادہ بد دماغ اور سانپ سے بھی زیادہ زہریلا ہے ۔۔۔۔۔! اے

زمین ۔۔۔۔ یہ اشرف المخلوقات دراصل سب برائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے یہ مادیت کی بے لگام قوتوں کے حصار میں ہے۔ جن بالیدہ لوگوں کی تم بات کرتے ہو۔ بھلا اُن کی گنتی ہی کیا ہے۔۔۔۔!"

زمین اُس کی وادیوں اور اُس کے پہاڑوں کی وشال ندامت میں اب جیسے قرنوں کی ٹھٹھری ہوئی ٹھنڈ اور یخ بستگی شامل ہوئی۔

"اے حق ناشناس ہوا۔۔۔ غالباً تم انسان کو حقیر ٹھہرانا اپنا بڑا کارنامہ تصوّر کرتی ہو۔ تمہاری یہ تنگ نظری دراصل تمہارے تعصب کی علامت ہے۔ تم اپنی انفرادیت کی پاسداری تو کرتی ہو لیکن دوسروں کی خودی کو تسلیم نہیں کرتی تم دوسروں کی خودی کو ضعیف کرنے کے نامنّاسب ارادے سے باز آؤ اور یہ بات اچھی طرح جان لو کہ قطرے سے گہر بننا آسان ہے لیکن آدمی سے انسان بننا بہت مشکل ہے۔ تمہارے اس کرہ ارض میں یوں تو آدمی اربوں میں ہیں لیکن انسان بہت کم ہیں۔ اتنے کم کہ کبھی کبھی تم جیسا حق ناشناس نیاز مندانہ گستاخی کے ساتھ حکایات وشکایات کے دفتر کھولنے بیٹھتا ہے اور بہترین دلائل کے باوجود اپنی جسارت سے باز نہیں آتا۔۔۔۔! اے ہوا۔۔۔ یہ جہانِ رنگ و بو۔۔۔۔ کمال کا نہیں تکمیل کا مقام ہے۔ یہاں اگر آدمی اپنے پوشیدہ امکانات کو عملی شکل دے تو مٹی سے جام تیار کرے ۔۔۔۔! ویرانوں کو گلستانوں میں بدل دے۔۔۔! سنگلاخ پتھر میں آئینے کی جلا پیدا کرے۔۔۔۔!

زہر کے سینے میں تریاق کو تلاش کرے۔ !وہ چاہے تو اس طرح کائنات کی قوتوں کی تسخیر کرے۔ لیکن وہ احسن تقویم کے باوجود اسفل السافلین میں جاگرے تو کوئی کیا کرے۔ دراصل حیوان ناطق اُس تجلی کے دھارے سے ابھی پوری طرح فیضیاب نہیں ہو پایا۔۔۔ اُس کی تمہاری اور ہم سب کی اُمید کا محور بس وہ روشنی ہے۔۔۔۔ محبت کی روشنی۔۔۔۔۔ !یہی ایک جلوہ ہے، ایک تابناک حقیقت ہے جس میں ابدیت کی شان مضمر ہے۔۔۔۔ لہذا۔۔۔۔۔۔تم بھی اپنے عشق کی جوت جلاؤ اور آدمی کو انسان بننے کی عظیم مہم میں اپنا تعاون دو۔ حق کی تجلی سے منوّر رہو کر اپنا فرض ادا کرتے رہو اور نتیجے کی فکر نہ کرو کیونکہ وہ کام کسی اور کا ہے۔۔۔۔۔ !یاد رکھو انسان کو قول اور عمل کی مکمل آزادی حاصل ہے کیونکہ اس آزادی کے بغیر اس کے کردار کو جانچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ یہ آزادی یا یہ امانت اُٹھانے سے ہم سب نے انحراف کیا لیکن انسان آگے آیا اور اُس نے یہ ذمہ داری قبول کی لہذا ہم سب کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ انسان کے اس بارِ امانت میں اُس کو اپنا ہر ممکن تعان دیتے رہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔! ''

☆☆☆☆☆

اِنضمام

سر بفلک پہاڑوں پہ وسیع و عریض باندھ پر منجمد آب کی تہہ ہر دن گزرنے کے ساتھ دبیز اور مضبوط ہوتی جارہی تھی ۔ موسم سرما کی سہمی سہمی سی دھوپ میں اپنی مرمریں شفاف اور ہموار سطح دیکھ کر ایک دن صبح وہ بے اختیار مچلنے اترانے لگی۔ اپنی ابتدا اور انتہا سے انجان وہ اپنی بلوریں سطح پہ نہ جانے کیا کیا گُماں کرنے لگی۔۔۔! پھر اِسی ترنگ میں اچانک اُس کی نگاہ اپنے زیریں بہنے والے باندھ کے پانی پر پڑی۔ یخ کی تہہ کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ پانی نہیں بلکہ ایک گستاخ دخل انداز ہے جو اپنے تلاطم سے اُس کا سکون اور سکوت درہم برہم کرنے کے درپئے ہے۔۔۔!

''اے رواں دواں پانی'' یخ کی تہہ نے سرد مہری سے کہا۔ ''بہتر رہتا اگر تم اپنا یہ شغل کسی اور جانب جاری رکھتے کیونکہ تمہارے اس تلاطم اور پیہم متحرک رہنے سے مجھے بے حد کوفت ہوتی ہے۔ اپنی یہ سیمابی کیفیت لیکر تم کسی اور جانب نکل جاؤ اور میری جان چھوڑ دو۔۔۔! تم میں آخر اتنی سمجھ تو ہونی چاہیئے کہ دوسروں کے آس پاس بے جا دخل اندازی اچھی بات نہیں، تم

شاید نہیں جانتے کہ تمہاری اس بے معنی اچھل کود سے میرے توجہ بٹ جاتی ہے اور میں اپنے مداحوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکتی۔۔۔!"

یخ کی تہہ کے مداح کوئی اور نہیں بلکہ اُس کی چکنی ہموار سطح پہ پھلسنے کے مُشتاق لوگ تھے جو پہاڑی جاڑوں کے بے کیف شب و روز میں دھوپ نکلتے ہی اُدھر آنکلتے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد نوعمر لڑکوں کی تھی۔ اس سال سردیوں میں کچھ زیادہ ہی شدت آگئی تھی اور پاس پڑوس کے لگ بھگ سبھی ندی نالے جم گئے تھے۔ باندھ کی منجمد تہہ آب پر قرب و جوار سے آئے ہوئے نوجوانوں کی سب سے زیادہ بھیڑ جمع ہو جاتی اور لمبی پھلسن کے ہر دور کے ساتھ شائقین کی تالیاں گونج اُٹھتیں اور وہ نئی اُمنگ سے ایک بار پھر منجمد تہہ پہ اپنا کھیل جاری رکھتے۔۔۔۔

"اے یخ! میں تم سے معاملہ فہمی کی توقع رکھتا ہوں۔" پانی نے بہتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہیں یہ احمقانہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ تمہیں چاہئے کہ میرے لئے تھوڑی سی گُنجایش نکال لو۔ لیکن تم ہو کہ مرے سر پر سوار ہو رہی ہو اور مجھے نحیف بنا رہی ہو۔ یاد رکھو! اگر تم اپنے طور طریقے نہیں بدلتی تو مجھے بھی چار و ناچار کہیں سے ٹوٹ کے نکلنا پڑے گا۔ میں زیادہ دیر تک دبنے اور نچلا بیٹھنے کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے اپنے بہاؤ کے لئے کون سی سمت اختیار کرنی ہے۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگر میں تھوڑا سا بھی دھکم دھکا سے کام لوں تو تمہاری یہ ساری خوبصورتی ایک لمحے میں ہوا ہو کے رہ جائے گی۔ ہونہہ۔ بڑے آئے رُخ تبدیل کرنے والے۔۔۔۔۔!"

''تم نے یہ کیا اگر مگر لگا رکھی ہے۔ اعتماد ہے تو میدان میں آ جاؤ۔ ورنہ یہ گیدڑ بھبھکیاں کسی اور کو دینا۔!'' یخ نے نہایت تضحیک سے کہا۔

''تھوڑی سخت اور مضبوط کیا ہو گئی ہو کہ اپنی عاقبت تک یا د نہیں رہی۔'' پانی نے کہا ''لیکن میں بھی کتنا بھولا ہوں، بھلا تمہیں برف پگھلنے کے متعلق کیا پتہ ہوگا۔ تم تو محض منجمد آب کی ایک حقیر سی تہہ ہو۔۔۔۔ہونہہ۔۔۔۔۔!''

''لگتا ہے تمہیں اپنے گرد و پیش کے متعلق کچھ زیادہ ہی واقفیت ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اپنی ضرورت کے مطابق اپنا راستہ چن لو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ سمجھے۔۔۔!'' یخ کی تہہ نے نہایت رعونت سے جواب دیا۔

پانی جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا لیکن تب ہی اس کا کچھ اور حصہ منجمد ہونے لگا۔ بے بس پانی کی آواز اس قدر کمزور ہو گئی کہ خود اُسے بھی بہ مشکل سنائی دے رہی تھی۔ اُدھر یخ کی تہہ کچھ اور دبیز ہوتی رہی۔ اُس کے گُماں کچھ اور بڑھتے رہے اور اُس کی خود فریبی میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا رہا۔ تاہم پانی نے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرتے ہوئے یخ سے کہا:

''میں کہتا ہوں تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ تمہارے نیچے کیا ہو رہا ہے۔؟''

''میں بھلا یہ زحمت کیوں اُٹھاؤں کہ میرے نیچے کیا ہو رہا ہے۔ پانی ہے تو اُسے وہیں رہنے دو۔ وہ کتنی بھی شیخی بگھارتا رہے آخر وہ

میرے قدموں میں ہی تو ہے۔ ایسے ڈینگیں ہانکنے والے بے کل بہتے وجود سے ادراک کی کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟ بکھرنا جن کی فطرت میں شامل ہو وہ بھلا کیا سمٹ سکتے ہیں ۔ اوہ فو۔۔ یہ میں بھی کن فضولیات میں اُلجھ گئی۔۔۔۔!وہ میرے شائقین کی ایک اور جماعت میری عزت افزائی کے لئے آگے آرہی ہے۔۔۔۔۔!"

وہاں سچ مچ بھڑ کیلے پوشاکوں میں چیختے چلاتے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد مجتمع ہو رہی تھی ۔ ایک طرف کرسیوں کی قطاریں لگی تھیں جن پر حسین مسکراتی خواتین محظوظ ہو رہی تھیں ۔ اُن کے پیچھے صحت مند مردوں کی ایک جماعت کھڑی تھی ۔ یخ بستہ شیشے کی سی تہہ پر شائقین نہایت جوش و جذبے سے پھسل رہے تھے ۔ بعض مشتاق کھلاڑی اپنے کرتبوں کا مظاہرہ کر کے حاضرین سے داد وصول کررہے تھے۔ ایک اور گوشے میں نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ اُن کی رگ رگ میں زندگی کے نشاط کی لہریں دوڑ رہی تھی ۔ ہر لمبی پھلسن دیکھنے کے ساتھ ہی اُن کے بدن میں ایک خُمار آلود سنسنی دوڑ جاتی۔

"یخ کی تہہ اپنی خود فریبی کے عالم میں کچھ زیادہ ہی پھول رہی تھی ۔۔۔۔۔" یہ تڑکتی بھڑکتی زندگی کا غلغلہ صرف میرے دم قدم سے ہے۔ یہ میری سنگ مرمر جیسی مضبوط بلوریں سطح کی گویا عزت افزائی ہو رہی ہے۔!" یخ کی تہہ خوشی سے پھولتی رہی۔ اور اس کے شبستان پر لوگ پھسلتے رہے۔ یخ کا بس چلتا تو وہ یہ گہما گہمی ہمیشہ اسی طرح جاری رکھتی ۔ اُدھر پانی الگ تھلگ چپ چاپ قطرہ قطرہ بہتا

رہا۔۔۔!

شام کے سائے پھیلتے ہی باندھ سیلانیوں سے خالی ہو چکا تھا پھر دور اُفق پر آوارہ بادلوں کے منتشر ٹکڑے منڈلاتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گردِ وپیش کی ساری دنیا کُہر پوش فضاؤں میں چُھپ گئی۔ اس کے ساتھ ہی برف کے موٹے موٹے ملایم اُجلے اُجلے گالے دائروں میں ناچتے ہوئے گرنے لگے پوری کائنات جیسے ایک گہری نیند میں ڈوب گئی۔ یخ کی تہہ اس نئی صورت حال سے حیران و پریشان رہ گئی۔ پھر بہت دیر بعد وہ بھی برف کا دبیز لبادہ اوڑھے گم سم اونگھنے لگی۔ اُدھر تسنیم وکوثر میں دھلے ہوئے گول گول نرم نرم پاکیزہ برف پارے اپنے آپ کے ساتھ کچھ یوں بڑبڑا رہے تھے:

”واہ۔۔۔۔! کل صُبح جب یہ سوئی ہوئی سرزمین اپنی آنکھیں کھولے گی تو میرے پھیلائے ہوئے سحر کاری کے ان مناظر سے کس قدر محظوظ ہوگی۔ ایسے خوش لباس ایام بھلا اسے روز روز کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ ایسے یادگار اتفاقات بہت کم ہوتے ہیں جب عرش کی بلندیوں سے ہم جیسے پاک مسافر نورانیت کی تشہیر کے لئے اس زمین پر قدم رکھتے ہیں۔۔۔۔! ہمیں اس ساری سطح زمین کو اپنی مقدس سفیدیوں سے اچھی طرح ڈھک دینا چاہئے۔۔۔۔!“

صبح ہوتے ہی حد نگاہ تک ہر زرہ برف سے ڈھک گیا تھا۔ یخ کی تہہ اب کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اُس کی شفاف سطح پر اب برف کی ایک موٹی سی تہہ بچھ گئی تھی۔ اُس کی حالت یہ تھی کہ اب وہ باہر جھانکنے کی بھی متحمل نہیں رہی تھی۔۔۔۔! یہ کرب ناک صورت حال دیکھ کر اُس کا شیشے جیسا نازک

دل ٹوٹ گیا۔۔۔۔۔

''آہ۔۔۔۔! یہ میری کیا حالت ہو کر رہ گئی۔۔۔۔۔ نہ جانے یہ کم ظرف برف کہاں سے آن مری۔ ابھی تک تو کسی نے بھی ایسی گستاخی نہیں کی تھی۔۔۔۔ وہ پانی کے بہاو کا معاملہ تو اس کے مقابلے میں معمولی سی بات تھی۔۔۔۔۔''

برف پارے یخ کو حیرت و استعجاب سے دیکھتے رہے۔ ''ہم آسمانوں سے آئے ہیں بڑی بی! ہمارا جہاں جی چاہے وہاں آکر سفید طلسماتی چادر بچھا دیتے ہیں۔ بھلا کون ہے جو ہمیں روکنے ٹوکنے کی جسارت کر سکے وہ دودھیا ابر پارے اب ہمیں لئے چلنے سے معذور تھے، لہذا ہم فضا میں رنگ اور نور بکھیرتے یہاں آ گئے۔ لیکن اے یخ۔۔۔۔! تمہاری یہ سرد مہری ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ بجائے اس کے کہ تم اپنی مسرت کا اظہار کرو کہ ہم نے اپنی نورانی چادر بچھانے کا اعزاز تمہیں بخشا۔ تم یہ کس قدر بیہودگی سے ہمارا خیر مقدم کر رہی ہو۔ شاید تم نہیں جانتی کہ ایسی باتوں سے ہمارے لطیف جذبات کو کس قدر ٹھیس پہنچتی ہے۔۔۔۔۔!!''

یخ کی تہہ برف کی باتوں سے نہایت غضب ناک ہو اُٹھی۔۔۔ ''لطیف جذبات اور تمہارے ہونہہ! تم۔۔۔۔ جو بن بُلائے مہمان کی طرح ٹپک پڑے ہو۔۔۔ میرے نہایت حسین مناظر کو اپنی بے خانماں پرتوں سے ڈھک کر تم نے میری خوشیوں کو غارت کر کے رکھ دیا۔۔۔ لیکن اس بے جا دخل اندازی کا تمہیں بھی خمیازہ اُٹھانا ہوگا۔۔۔۔ سمجھے۔۔۔۔۔!'' یخ کے الفاظ میں تیز اُسترے کی سی

کاٹ تھی۔

''تم نے ہمیں بے خانماں کہہ کر پُکارا۔۔۔۔!'' برف پارے اپنا سکوت توڑ کر بولے ''لیکن اے یخ کی حقیر تہہ۔ تمہاری بھی اس میں کیا خطا ہے۔ یہ تو دراصل تمہاری نیچ ذات بول رہی ہے۔ اس زمین کے گندے گڈھے میں رہنے والی گھٹیا ذات سے بھلا اور توقع ہی کیا رکھی جاسکتی ہے۔۔۔۔! بھلا میرے برفاب لباس کی کرامات تمہیں کیسے پسند آسکتی ہے۔ ایک یاس زدہ جنس خام کے ڈھیر کی اوقات ہی کیا ہے۔ ہم آوارہ گرد ضرور ہیں۔ لیکن ملائم معصوم اور مدبر ہیں۔ آسمان کی وسعتوں میں سفر کرنے والے سفید بے داغ دُھلے دھلائے بادل ہمارا مسکن ہیں۔ ہم نے فضا میں آوارہ سفید بادبانوں سے ہجرت کر کے زمین کے باسیوں کو خالق کے جمال اور جلال کی آگہی دِلائی ہے۔ لیکن تم جیسے جاہل بے حس وحرکت مظاہر۔۔۔ یہ لطافتیں اور یہ نزاکتیں بھلا کیا سمجھ سکتے ہیں۔۔۔!''

'' الف لیلوی پرستان کے نازک اندام بونو۔۔۔! اپنی یہ نزاکتیں سمیٹ کر یہاں سے فوراً دفعان ہو جاؤ۔۔۔۔!!'' یخ نے چلا کر کہا

''اگر یہ بات ہے اے یخ کی منجمد تہہ! تو غور سے سُن۔۔۔۔ ہم یہاں سے کسی بھی صورت میں ہٹنے والے نہیں ہیں۔ تم لاکھ چیں چیں کرتے رہو۔ لیکن ہم برف پاروں کی یہ دستارِ فضیلت تمہارے اوپر بدستور موجود رہے گی اور تم ہمارے قدموں میں پڑے اسی طرح سسکتے رہو گے۔۔۔۔!'' یہ کہہ کر برف پارے پھر پُرسکون ہو گئے۔

یخ کی تہہ تلملاتی رہ گئی اور آخر تھک ہار کر چپ چاپ لیٹی رہی۔

دوسرے دن آسمان بادلوں سے دھیرے دھیرے صاف ہونے لگا۔ برف باری پہلے ہی رُک گئی تھی۔ پھر آفتاب کی شعاعیں شرماتی ہوئیں اِکا دُکا بادلوں کی اوٹ سے جھانکنے لگیں۔ موسم کی خوشگوار دستک محسوس کرتے ہی یخ کی تہہ پہ پھلسنے والے سیکٹرس کی ایک بڑی تعداد اُمنڈ آئی۔ بعض مشتاق کھلاڑیوں نے ساری جگہ کا معائنہ کرنے کے بعد کہا:

"یہ برف ابھی نہ اتنی دبیز ہے اور نہ اتنی سخت! اگر ہم پڑوس کی بستی سے دو تین آدمی پکڑ لائیں تو وہ اسے بیلچوں اور جھاڑو سے ہٹا سکتے ہیں۔۔۔۔۔!"

تھوڑی دیر کے بعد وہ سچ مچ کچھ قلی پکڑ کر لائے جنھوں نے اپنے بڑے بڑے بیلچوں سے برف ہٹانا شروع کیا۔ جھاڑوں سے برف صاف کرتے ہی یخ کی تہہ سہمی سی دھوپ میں چمکتی دکھائی دینے لگی۔ برف پارے ڈھیر کی صورت میں ایک کنارے پر جمع ہو گئے۔ یہ نئی اُفتاد اُن کے لئے نہایت حوصلہ شکن اور ہتک آمیز تھی۔۔۔۔۔! اتنی ملائم معصوم اور مُدبر جنس کا یہ حال کر دیا گیا تھا۔ اُس کے بے ترتیب انبار اب شرم سار کھڑے تھے۔۔۔۔!!

"آہ۔۔۔ اس نامُراد سرزمین کے یہ باسی کس قدر غیر مہمان نواز ہیں۔ انہوں نے ہم جیسے نازک نو واردوں کے ساتھ کس قدر احمقانہ اور بے رحمانہ سلوک روا رکھا لیکن غلطی ہماری اپنی ہے۔ نہ ہم اپنی رفعتوں سے اُتر کر ان میں گھل مِل جاتے اور نہ یہ لوگ ہم پر اپنی

نفرت کی جھاڑو پھیرتے ۔ انہوں نے ہماری اتنی تحقیر کی جیسے ہم
کچرے کا ڈھیر ہوں ۔ توبہ ۔۔۔۔ توبہ ۔۔۔! ہم آسمان میں سفر
کرنے والوں کو زمین کی پاس تک نہیں آنا چاہئے!''

اُدھر یخ کی تہہ پہ شائقین کے کھیل نئے جوش و خروش سے شروع ہو گئے تھے ۔ ہر طرف قہقہوں کے فوارے پھوٹ رہے تھے ۔ اس طوفانِ بدتمیزی میں اچانک شوخیوں اور شرارت کا زاویہ بدل گیا ۔ نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں نے ایک دوسرے پہ برف کے گولے پھینکنے شروع کئے ۔ اُن کے میلے میلے چھوٹے ہاتھ برف کے ڈھیر پر بار بار جھپٹ رہے تھے ۔ برف کا بُرا حال ہو گیا ۔ اس کے ڈھیر میں بڑے بڑے گھاؤ ہوئے لیکن نوعمر لوگوں میں برف ترنگ برابر بڑھ رہی تھی ۔ جونہی برف کا لہراتا ہوا گولہ کسی نوعمر کے بدن یا پھر اُس کے لباس سے چھو جاتا تو وہاں نعرے بلند ہوتے اور پھر قہقہوں کے بے پناہ شور میں زور زور سے تالیاں بجائیں جاتیں ۔ ہر طرف اُچھلتی برف دیکھکر یخ کی تہہ کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا:

''اب دیکھا انجام لاف و گزاف کا ۔۔۔! بڑے آئے تھے
آسمانوں سے ۔۔۔ ارے یہ زمین ہے یہاں تم جیسے نازک اندام کا
بھلا کیا کام ہے ۔۔۔! تمہیں تو وہیں آسمان میں رہنا چاہئے تھا ۔
یہاں کسی کو تمہاری ضرورت نہیں ۔۔۔ سمجھے ۔۔۔۔ کیا کہا تھا ۔ تم
نے ۔۔۔ ہمارے قدموں میں سسکتے رہو گے ۔ کیوں ۔۔۔؟
اب کہاں گئی وہ اکڑ فوں ۔۔۔ ہونہہ ۔۔۔ چلو تمہارا کام تو ہو
گیا ۔ لیکن کم بخت اِس پانی کی مسلسل کل کل مجھے بے کل بنا رہی

ہے۔ یہ شیخی باز بھی مجھ پہ چھا جانے کا متمنی رہا۔ اندھا -----
احمق -----! اسے یہ معلوم نہیں کہ ساکت و جامد رہنے کا امتیاز
صرف مجھ ہی کو حاصل ہے ---------!"

"ارے تم یہ میری مناسبت کس سے کر رہی ہو" پانی کی گرجدار آواز
نیچے سے اُبھری۔ "کیا تم مجھ جیسے پُر قوت اور پُر شور ذات کا مقابلہ
اِس نازک و نحیف برف سے کر رہی ہو -----اے سکتے کی شکار
یخ -----! تم اچھا مذاق کر لیتی ہو -------!!"

ٹوٹے پھوٹے ------نِکھرے بِکھرے ------برف پارے
اپنی اس نئی تذلیل اور تضحیک پہ چُپ نہ رہ سکے۔ وہ کچھ اس طرح پانی سے
مخاطب ہوئے:

"تو کیا تمہاری دانست میں صرف طاقت ہی قابلیت کی واحد کسوٹی
ہے ---- واہ تمہاری اس زمین کے معیار و میزان بھی کیا خوب
ہیں ----! ویسے حقیقت پسندی سے دیکھیں تو یہاں کی اِن
پستیوں میں سبھی ایک جیسے ہیں -----چاہے یخ ہو -----
چاہے پانی یا اور کوئی تخلیق ----! دراصل یہاں کی کوئی جِنس ہماری
صُحبت کا استحقاق نہیں رکھتی --------! لیکن آہ -----یہ بات
ہمیں بہت دیر میں معلوم ہوئی بہت دیر میں -----!"

چند دن بعد مطلع صاف ہونے لگا۔ بہار کوہسار کی بُلندیوں پر
دستک سی دینے لگی۔ اس اولین دستک کے ساتھ ہی پہاڑوں پر جمی ہوئی
برف کی اوپری تہہ پگھلنے لگی۔ بلندیوں میں واقع کئی گرم چشمے بھی پھوٹ

پڑے نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی دنوں میں چوٹیوں کے آس پاس سے ایک پُرشور نالہ چیختا چنگھاڑتا باندھ کی اور بڑھنے لگا۔ منجمد یخ کی تہہ کے نیچے پانی میں ایک ہلچل سی بیدار ہوئی۔

"میرے لئے راستہ بناو۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔۔۔۔ پہاڑی ریلا طوفانی رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔ میں کہتا ہوں اے یخ۔ اپنا سکتہ توڑ دو۔۔۔۔!"

"نہیں۔ کبھی نہیں۔!" یخ نے غضب ناک ہو کر متنبہ کہا۔۔۔۔ میں ایک انچ بھی سمٹنے والی نہیں تم کیا سمجھتے ہو۔ میں تمہاری اِس دھمکی سے مرعوب ہو جاوٗں گی۔ ہونہہ۔۔۔۔۔!"

اُدھر پانی کے اندر تلاطم اور ہنگامہ خیزی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بپھر اُٹھا۔۔۔۔۔۔۔ "اگر تم اسی طرح اپنی احمقانہ اکڑ کا مظاہرہ کرتی رہی تو میں تمہیں بہالے جاوٗں گا۔۔۔۔۔!"

پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد پانی کا ایک زبردست ریلا بے پناہ زور و شور کے ساتھ آگے بڑھا اور یک بہ یک یخ کی تہہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دھماکے کے ساتھ دراڑ پڑ گئی۔! پھر دن کی تمازت کے ساتھ اُس کی خود فریبیوں کے تاج محل بھی چکنا چور ہونے لگے۔ اپنے زوال کا عروج بھانپتے ہی یخ کی تہہ اچانک گڑگڑانے لگی۔۔۔۔۔

"اے سیماب صفت پانی! میں اب اپنی وُسعتیں سمیٹ رہی ہوں۔۔۔۔! کیا ہم اچھے ہمسایوں اور اچھے دوستوں کی طرح نہیں رہ سکتے۔۔۔۔۔!"

یخ کی تہہ نے اگر چہ یہ تجویز انتہائی ہنگامی حالات میں رکھی تھی۔ لیکن پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ دوسرے ہی دن اُنہیں اس سے بھی بہتر ہم آہنگی کا شرف حاصل ہوا۔ یخ کی تہہ مہین ہوکر ان گنت ٹکروں میں بٹ گئی۔ پھر ہر ٹکرا پگھل کر پانی میں تحلیل ہونے لگا۔۔۔! اُدھر بے چارے برف پاروں کا دل بھی دھڑ کا۔۔۔۔ اُس کے ڈھیر ٹوٹتی یخ کے ہر ٹکرے کے ساتھ پگھل پگھل کر پانی میں گرتے رہے۔۔۔۔۔ وہ گرتے۔۔۔۔۔ پڑتے۔۔۔۔۔۔ بہتے۔۔۔۔۔۔ روتے رہے۔۔۔۔۔۔! پانی۔۔۔۔ یخ اور برف۔۔۔۔ تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے۔۔۔۔۔۔۔ ایک دوسرے کے وجود میں تحلیل ہوکر لازوال دریا کی بیکراں وُسعتوں میں مستغرق ہوگئے۔۔۔۔!!

☆☆☆☆☆

شکستِ شب!

خزاں کا ایک اُداس دن تھا۔۔۔!

جنگل میں تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ زرد پتّے درختوں سے جھڑ جھڑ کر گر رہے تھے۔ جنگل کے مرجھائے ہوئے پھولوں کی پنکھڑیاں ہوا میں چاروں طرف منتشر ہو رہی تھیں۔ صنوبر کی قطاروں میں تُند ہواؤں سے ایک افسردگی چیخ رہی تھی۔ سفیدے سے ہوا کا ہر جھونکا پتّوں کو اُڑا کر اپنے ساتھ لے جاتا۔ سرو اور شمشاد کا جُھنڈ جیسے آہیں بھر رہا تھا۔ پہاڑی جھیل کے کنارے چنار کا عظیم درخت خزاں کے لمس سے تھر تھر کانپ رہا تھا ہر جھکڑا کے ساتھ اُس کے شاہکار پتے اپنی ٹہنیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر کچھ اس انداز سے گر رہے تھے کہ ان کے گرنے کی گونج سے کونجیں تک سہم کر رہ جاتیں اُدھر ہر پتے کے گرنے سے جھیل کی سطح کانپ اُٹھتی۔ پھر جب اس کا نیلی سطح آب پر زرد زرد سرخ سرخ پتوں کی شطرنج سی بچھ جاتی تو ہواؤں کے چیختے جھکڑ اس بچھی ہوئی بساط کو اُلٹ کے رکھ دیتے اور پانی کی موجیں اِس بحرِ طوفان خیز کی تلاطم میں شورِ محشر کا سماں برپا کر دیتیں۔۔۔۔!

میں فطرت کا یہ غیض وغضب دیکھ کر مُضطرب اور منتشر تھا۔ خزاں کی اُس شام کو میں جنگل کے اندر دور تک نکل گیا تھا۔ چاندنی کے وقتی سکوت میں بے برگ وثمر درختوں کو دیکھ کر میں یہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے بہار کا ہاتھ کیونکر چھوٹ گیا نہ جانے سبزے سایوں کے قبضے میں کیونکر آ گئے نہ جانے کرنیں کہرے کے زندان میں کیونکر پھنس گئیں۔۔۔۔! پھر میں نے دیکھا کہ چاند کا عکس پانی میں رنگ برنگ مچھلیوں سے جیسے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ میں چند لمحوں کے لئے حُسن اور لطافت کے اِس منظر میں کھو کر رہ گیا لیکن تب ہی صنوبر کے جنگل تیز وتُند آندھی کی چنگھاڑ سے لرز اُٹھے اور میرا یہ خواب منتشر ہو کے رہ گیا۔ پھر جو میں نیم خشک زرد پتوں پہ آگے بڑھا تو میرے چلنے سے ایک کھڑکھڑاہٹ سی پیدا ہوئی۔ میں چنار کے تنے کا سہارا لے کر پت جھڑ کی رُت کو دیر تک دیکھتا رہا۔۔۔۔

اب ہوا رُک گئی تھی لیکن سیاہ مٹیالے بادلوں نے آسمان کو اب بھی گھیر رکھا تھا پھر کہیں بادلوں کی چادر میں ایک سوراخ سا ہوا جہاں سے چاند کی مہکتی کرنیں چمکنے لگیں۔ میں چاند کی اس مسکراہٹ سے جس قدر زیادہ مستفیض ہوتا رہا اُتنا ہی وہ ہارسنگھار کی خمیدہ ٹہنیوں کے عقب سے مسکراتا رہا۔۔۔۔! پھر میں نے دیکھا کہ وہ ایک بار پھر جھیل کی گود میں سما گیا ہے۔ لیکن اب جو میں نے اپنی ذات کے اندروں میں جھانکا تو وہ خود میرے دل کی گہرائیوں میں بھی آباد تھا۔۔۔۔! یہ تغیر اچانک آ گیا تھا۔ ابھی تک تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ تیز وتُند آندھی اور گہرے بادل اِنسانی آزمائشوں اور ابتلا کے غماز ہیں لیکن اب چاندنی کا نور میری آنکھوں کے سامنے بے نقاب

تھا میں اسی الجھن میں تھا کہ تب ہی ایک مُدھر اور مُترنم آواز ۔۔۔ ایک صدائے بازگشت بن کر ۔۔۔۔ جیسے میرے کانوں میں رس گھولنے لگی ۔۔۔۔!

یہ ''ون کستور'' کی آواز تھی ۔ جو میرے پاس ہی اوپر کسی ٹہنی سے یہ ترنم بکھیر رہا تھا ۔ ''اے میرے مسافر! یہ تابندگی اُس چاندنی کی ہے جو بہشت بریں میں چمکا ہے ۔۔۔۔!'' میری متجسس آنکھیں اس فردوسی آواز کو تلاشتی رہیں ۔ پھر میں نے دیکھا کہ یہ درویش صفت پرندہ چاندنی میں نہائے خود میرے چہرے کو گھور رہا تھا ۔

''لیکن اس سے چاندنی کی رخشندگی میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی ۔ اس کی ضیا میں ابدی امن کا سدا بہار قول و قرار اب بھی موجود ہے ۔۔۔۔!''

میری ذات ابھی اس سحر انگیز آواز کے طلسم سے نکل بھی نہ پائی تھی کہ ایک اور آواز میری سماعت سے ٹکرائی یہ انتہائی کرخت اور ناخوشگوار آواز ، طائیر شب کی تھی ، جو میرے ٹھیک اوپر ایک شاخ پہ جیسے جھول رہا تھا ۔ اُس کے گہرے سیاہ پنکھ جیسے پرواز کیلئے پرتول رہے تھے وہ کہہ رہا تھا :

''کرن رُتوں کی بشارت دینے والے احمق پرندے! تم نے خود اپنی ذات کو ان گنت داستانوں کا پیکر بنا کے رکھ دیا ہے ۔۔۔۔!''

''اے ظلمتوں کی نقیب طائیر شب !'' ون کستور نے خوش لحن لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا ''تمہیں یہ اپنی گوشہ نشینی سے نکلنے کی کیا سوجھی ۔ تمہارے لئے بہتر رہتا اگر تم اپنے گم گشتہ آشیانوں میں مقید

رہتے!''

میں دونوں کے درمیان ہونے والے اس مکالمے کا باقی حصہ نہیں سُن سکا کیونکہ تیز آندھی کے شور نے چاروں طرف ایک دہشت سی پھیلا دی تھی جس کے نتیجے میں درختوں کے بدن سے پتوں کے بچے کھچے برگ۔ اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے۔ بہت سے درختوں نے اپنے سر جھکا دئے تھے۔ بعض غم کے مارے سسکیاں لے رہے تھے۔

''لیکن اے کستور! کیا تم کسی اجنبی دُنیا سے کوئی نیا سندیش لے آئے ہو!'' صنوبر کا درخت حقارت سے چلا اُٹھا۔ اُس کی شاخیں آندھی کی شدت سے جھک جھک رہی تھیں۔

''تو کیا ۔۔۔ چاندنی کی مہک تم تک بھی نہیں پہنچ سکی اے صنوبر؟!'' مُترنم پنچھی نے اپنی پُر جلال آواز میں کہا۔

''ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ہم لوگ بے برگ وثمر ہو کر ماضی کی عظمت کے ویراں کھنڈر بن کر رہ جائیں گے ۔۔۔!'' چنار نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا۔

''اُف! یہ ہماری ہستی کی کتنی بڑی تضحیک ہے ۔۔۔!'' شمشاد نے شکایتی لہجے میں کہا'' دست فطرت پہلے ہمیں پروان چڑھاتی ہے۔ پھر ہمیں حسین لبادوں سے آراستہ کرتی ہے۔ ہمیں ایک بیش بہا عطیہؔ بنا کے پیش کیا جاتا ہے لیکن پھر اچانک ہماری رعنائیوں اور ہمارے حسین وجود کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ کاش ۔۔۔ ہم سب اُگنے سے پہلے ہی منوں مٹی تلے دفن کئے جاتے ۔۔۔!''

"واہ دوست! تمہارے ارادے تو ان پربتوں سے بھی بلند ہیں۔"
طائیر شب کی کریہہ آواز پکار اُٹھی "کیا اتنے مہینوں کی شوکت سے تمہارا جی نہیں بھرا۔۔۔ ایک مختصر سی بہار۔۔۔ پھر اُس سے بھی مختصر گرمیاں اور پھر فنا! یہی ہے نا تمہاری فطرت کا قانون۔۔۔۔۔!
ایک شیریں فریب! ایک سراب۔ ہاہاہا۔۔۔"

اس کے ساتھ ہی تیز ہوا کی ایک پُر جوش لہر نے جنگل کے وحشت کو اور بڑھا دیا۔ اب کے آندھی اس شدت کی تھی کہ بعض تناور درختوں کی شاخیں بھی ٹوٹ کر گر گئیں۔ جنگل دہل اُٹھا۔ اور ہر طرف ایک کہرام سا مچ گیا۔۔۔!

"نہیں۔۔۔۔۔ یہ قانون نہیں۔۔۔۔ یہ تو محض ایک استثنا ہے۔۔۔!" یہ ون کستور کا وہی مترنم لہجہ تھا لیکن اس بار اس آواز کی گونج پھیلتے ہی سیاہ گھنے بادلوں کی اوٹ سے چاند کی تقدس مآب روشنی پھوٹ پڑی۔۔۔ روشنی۔۔۔ جو شفق سے زیادہ رنگین۔۔۔ نرگس سے زیادہ مُعطر اور نغمے سے زیادہ طرب انگیز تھی۔۔۔۔۔۔۔!

حُزن و ملال کے پیکر درخت پُر کیف نور میں نہا گئے، ان کی عریاں بدن چمچماتی چاندنی کی نفیس لبادے سے ڈھک گئے۔ بارشوں میں دُھلے اور آندھیوں سے ہلتے وہ ایسے لگ رہے تھے جیسے ستاروں کی مقدس چھایا میں کوئی آسمانی وجود ہوں۔۔۔!

"اے جنگل کے معصوم درختو! ایک بار پھر اپنے سر بُلند کر لو۔۔۔!"
ون کستور کوہ عزم بن کر پکار اُٹھا "یوں سمجھ لو کہ جوش و غضب کا یہ مرحلہ

ایک مختصر مُدت کا ہے۔ بس محبت ہی ایک ایسی نادر جنس ہے جو لازوال ہے۔ یہ تباہ کاری کی طاقتیں تو عارضی ہیں۔ ان کا زور بس چند روزہ ہے۔ ہاں حُسن ترتیب اور نظم و ضبط کو بقائے دوام حاصل ہے۔ بے لگام طاغوتی طاقتیں رات کے سینے پر بدی کی سفیر اور فنا کی پکار بن کر چھا سکتی ہیں۔ لیکن اس رات کے بعد جب سحر کی ضیا پوش کرنیں پھوٹتی ہیں تو اندھیرے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ گھنے سیاہ بادلوں کے اُس پار چاندنی اپنی پُر سکون کرنیں لُٹاتی رہتی ہے۔ بہشتِ بریں کا وہی دمکتا چاند۔۔۔!"

"اے احمق پرندے۔۔۔۔! فضول کی اِن اُمیدوں سے بے چاروں کو کب تک بہلاتے رہو گے۔۔۔۔! وہ دیکھو اجل ان کی روح قبض کرنے کے لئے سامنے کھڑی ہے۔۔۔۔۔!" طائیر شب نے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

ٹھیک اُسی وقت بجلی کڑک کر گری اور شمشاد کا لانبا سجیلا درخت جُھلس کے نیچے گر گیا، بجلی اس درجہ برق انداز تھی کہ پاس کے چٹان کی دو کتلیں بھی ٹوٹ کر دور جا گریں۔۔۔۔میں ساکت و جامد رہ گیا۔۔۔۔!

'کیا وہ دن کبھی آپائے گا۔۔۔۔۔؟" میں اُٹھ کر بے اختیار چلا اُٹھا جیسے میں اپنے کسی ان دیکھے پر اسرار دوست سے مخاطب تھا" کیا وہ دن کبھی آپائے گا جب یہ آندھیاں اور الم تھم جائیں گے۔۔۔۔!نظم اور امن تو برحق ہیں لیکن ابھی یہاں۔۔۔۔قتل و خون کے موسم شباب پر ہیں۔ ابھی یہاں اِنتشار اور افتراق کی وجہ سے زندگی گرداب میں

ہے۔۔۔۔۔!ابھی یہاں طوفان اور مصائب کی برقِ بلاموت بن کر چھاتی جارہی ہے۔۔۔۔۔۔۔!!"

"اے شکوک وشبہات میں گھرے سوالی؟ کیا جنگل کے وحشی اور بے زبان مخلوق تمہارے ان وسوسوں کا جواب دینے کے لئے کھڑے ہوجائیں گے۔۔۔۔؟ وہ دور آسمان کی وسعتوں میں جھانکنے کی کوشش کرو۔ حدِ نظر تک پھیلی اِس وشال دھرتی کا نظارہ کرو۔! بیکراں سمندروں اور جھیل کی شیتل سطح سے نیچے نگاہ ڈال کر دیکھو۔۔۔! تمہیں ہر جگہ ایک ہی قانون کی عمل داری نظر آئے گی۔۔۔ یہ قانون صبح ازل سے قائم ہے اور یہ شام ابد تک قائم رہے گا۔۔۔! یہ نظم، ہم آہنگی اور مسّرت کا قانون ہے۔۔۔۔!"

"لیکن آہ۔۔۔۔۔! یہ قانون اکثر و بیشتر نہایت بے دردی سے توڑ دئے جاتے ہیں۔۔۔۔!" میں بے ساختہ پکار اٹھا" تم یہ حقیقت فراموش کر رہے ہو کہ انتشار کوئی قانون نہیں ہوسکتا۔ یہ اپنی چند روزہ بے ترتیبی کے بعد خود ہی شانت ہو جاتا ہے۔۔۔! دراصل اِنتشار۔۔۔۔۔ تباہی اور موت خود اپنی فطرت میں وقتی مراحل ہیں۔۔۔۔۔! چنانچہ بے لگام عفریتیں، جو ایک مخصوص مدت تک سرگرم رہتی ہیں اور اس رواں دواں زندگی کی ترتیب وتہذیب میں یہاں وہاں بے ترتیبی کا زہر بھرنے کے درپے رہتی ہیں۔ اُمید اور امن کے آشیانوں پر مایوسیوں کی آندھی بن کر بھرتی ہیں۔ لیکن یہ متضاد طاقتیں خود اپنے آپ کام نہیں کرتیں۔۔۔ یہ خود کسی قانون

کی متحمل ہی نہیں ہو سکتیں۔ یہ تو محض اِنتشار کی ایک وسیع تر حکمت کا حصہ ہوتی ہیں۔ ایک ایسی حکمت جس کی بنیادیں بہت گہری ہیں۔۔۔۔ زندگی۔۔۔۔۔ نظم۔۔۔۔۔ ہم آہنگی اور امن و سکون اس عظیم حکمت کی منطقی منزل ہے۔۔۔۔۔! اس منزل کی بیکراں وُسعتوں میں آنند کے بغیر کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔!

اور پھر جوں جوں اِس آسمانی آواز کی بازگشت بتدریج ماند پڑتی گئی۔۔۔۔۔ چاند بادل کے ایک ٹکڑے کو چیرتا ہوا اپنی نیلگوں کرنوں سے اندھیرے کا سینہ چاک کرنے لگا۔ آندھی خاموش ہو گئی تھی ممکن ہے کہ وہ دھرتی کے کسی دوسرے حصے کی اور نکل گئی ہو۔ جنگل چاند کی فردوسی روشنی سے منور تھا۔ چیخ و پکار کی جگہ ایک بار پھر محبت بھری سرگوشیاں میرے کانوں میں رس گھولنے لگیں۔۔۔۔!

"ہمارے دل آویز چاند۔۔۔۔! آندھی نے ہمیں وقتی طور پر بد حواس کر دیا تھا۔۔۔۔!" یہ صنوبر کی ندامت بھری آواز تھی۔۔۔۔
"ہم نے اُمید کی اُن کرنوں پر شک کرنے کی حماقت کی جن کی شفیق کرنوں سے ہم بار بار رخشندہ ہوتے رہے ہیں۔ دراصل اعتقاد کی حیثیت دل کے صحرا میں ایک نخلستان کی سی ہے۔۔۔۔۔! شب کے پھیلائے ہوئے فسوں کے نتیجے میں یہ نخلستان ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کیا تم ہمیں ایک بار پھر معاف نہیں کرو گے!"
"اے صنوبر! تم نے ہم سب کے دل کی بات کہی ہے؟" سرو نے کہا "اُس فردوسی طاقت کو بھلا یہ آندھی طوفان کیا چھو سکتے ہیں۔۔۔ ہم

سے لغزش ہوئی لیکن ہماری خطاؤں کو اُسی طرح نظر انداز کیا جائے گا جس طرح پہلے بھی درگزر سے کام لیا گیا ہے ۔۔۔۔۔۔اب دیکھ لو اے صنوبر ۔۔۔۔۔۔! یہ اِس فراخدلی کا اعجاز ہے کہ ہماری شاخیں کوثر و تسنیم سے دُھلے سفید سفید لباس سے آراستہ ہو رہی ہیں ۔۔۔۔!"

"یہ لبادے اُمید کے ہیں ۔۔۔۔!" شمشاد نے روتے ہوئے کہا کیونکہ اُسکے سنگی کی لاش ابھی سامنے پڑی ہوئی تھی۔

"کاش ہم لوگوں نے ماضی کے تجربات سے استفادہ کیا ہوتا۔تب شاید ہم سے یہ بدحواسیاں سرزد نہیں ہوتیں ۔۔۔۔!" چنار کے تنہا درخت نے نہایت متانت اور معذرت آمیز لہجے میں کہا "بے شک اگر ہمارے عقائد راسخ ہیں تو محرومی ہمارا مقدر نہیں بن سکتی۔جاڑے کی آمد آمد پر آندھی کا چیخنا چلانا کوئی نئی بات نہیں۔لیکن پھر چاندنی ہر موڑ پر آکر ہمیں سہارا ابھی تو دیتی ہے۔ تاکہ اُمید کی قندیلیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ نہ جائیں ، لیکن اس کے باوجود شک اور وسوسوں کے بادل ہم پہ برابر منڈلاتے ہیں تاہم آنے والے دن اپنی تمام اُمیدوں کے ساتھ زندہ رہتا ہے!

پھر ایک دن ۔۔۔۔ ہولے ہولے ۔۔۔۔ بہار دستک دینے لگتی ہے ۔۔۔۔! ہم سب ایک بار پھر زندگی اور حسن کے رنگوں سے مہک اُٹھتے ہیں ۔۔۔۔۔!"

اور اس طرح ۔۔۔۔اُس انوکھی رات کے باقی حصے میں بھی جنگل

کے اطراف اطمنان کی سرگوشیوں میں ڈوبے رہے اور میں صنوبر کے جنگلوں سے نکل کر اپنے دور افتادہ اور گم گشتہ کاٹیج کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن میری پلکیں بھیگ گئیں تھیں۔ آخر شب کے ہلکے اُجالے میں محللول ہوئے تارے کی طرح۔۔۔ ایک ستارا میری آنکھوں سے بھی چھلک پڑا۔۔۔! نہ جانے یہ سِتارا خوشی کا تھا یا غم کا۔۔۔! کبھی یہ زندگی رنگین خوابوں کی بستی تھی۔ اس میں تصّورات کے سُنہرے محل کھڑے مسکرایا کرتے تھے۔ تمنّاؤں کا ہجوم تھا لیکن آج یہی حُزن وملال کا موسم بن کر رہ گیا تھا۔ تصّورات کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ حدِ نظر تک یاس کے ویران کھنڈر نظر آرہے تھے۔۔۔۔۔! زندگی کے اُلجھے دھاگے جیسے مکڑی کے جال کی طرح اُلجھ کر رہ گئے تھے۔۔۔۔! لق ودق صحرا میں ہر طرف گرم گرم بگولے اُٹھ رہے تھے۔ لیکن ابھی جنگل میں تلاش و جستجو کے دوران۔۔۔۔ فردوسی چاند کی جاوداں کرنوں سے۔۔۔۔ میری اپنی ذات بھی مستفیض ہوگئی تھی۔۔۔۔۔!

پھر۔۔ برف کے پہاڑ۔۔۔ پگھل گئے۔ بہار نے آتے آتے ہی اُن بندشوں کو توڑ دیا جنہوں نے فطرت کو زنداں کا قیدی بنا کے رکھ دیا تھا۔ دھرتی کا انگ انگ رنگ ونور میں نہا گیا۔ چنانچہ جب میں درختوں کے درمیان گذرتے ہوئے فرحت بخش ہوا کی آواز پہ کان دھرتا تو مجھے سرشار اشجار کے پتوں کے ساز پر ایک ملکوتی نغمے کی صدائیں سنائیں دیتیں۔۔۔۔! آنے والے دن جیسے اپنی تمام اُمیدوں کے ساتھ بیدار ہو اُٹھتے۔۔ اُمنگیں آرزوئیں جی اُٹھتیں۔ جیسے بھولے بسرے خواب شرمندہ تعبیر ہو کر رہ جاتے۔۔۔۔!

آج برسوں بعد ۔۔۔۔ جب خزاں کے سوگوار موسم میں ۔ کبھی بچوں اور اُن کی ماں کو لے کر صنوبر کے جنگل کی اور نکل جاتا ہوں ون کستور کی خوش نوا مانوس اور مُدھر آواز نظم ، ہم آہنگی اور مسّرت کا وہی ابدی پیغام سنا رہی ہوتی ہے تو آسمان کی بیکراں وسعتوں میں بادلوں کو چیرتا چاند اپنی فردوسی روشنی سے اب بھی اُمید کی کرنیں لُٹاتا نظر آتا ہے میرے بچے جنگل کو دیکھ کر بہت سے سوال کرتے ہیں لیکن میں انہیں ہمیشہ یہی جواب دیتا ہوں :

''میرے بچو!
میرے جگر کے ٹکڑو ۔۔۔۔۔!
خوشی کبھی نہیں مُرجھاتی !''

☆☆☆☆☆

بہار آنے تک

نرگس نے آنکھیں کھولیں تو گلستان میں تاحدِ نظر ہری ہری زمردیں نو خیز گھاس دم سادھے خاموش کھڑی تھی ۔ اونچی اونچی جھاڑیاں ساکت و جامد تھیں جیسے محو حیرت ہوں۔ نسیمِ صبح کے جھونکوں سے پتیاں ہلتیں تو اِن کی لرزش سے ایسی کھڑ کھڑاہٹ پیدا ہوتی جیسے چھلکے اتارے ہوئے خشک اخروٹ ایک بورے سے دوسرے بورے میں گرائے جارہے ہوں۔ اِس صدائے بازگشت سے اُس کی محویت ٹوٹی اور اُسے یاد آیا کہ اُس کو جو کام تفویض کیا گیا ہے وہ نہایت عُجلت آمیز اور اہم ہے۔ اُسے بہار نے یہاں اپنا پیامبر بنا کے بھیجا ہے۔ نرگس کو یاد آیا کہ وہ کس قدر برق رفتاری سے منزلوں کو روندتی ہوئی گلستان تک پہنچ گئی تھی۔

صبا کے کرم فرما جھونکوں نے چمن والوں کو بیدار کیا۔ صبا کی اس لطافت میں کس قدر تضاد کس قدر بھرم تھا نرگس کو صبا کی یہ اٹھ کلیاں ایک آنکھ نہ بھائیں۔ اُدھر شبنم پھولوں کا منہ دھو کر ان کی شگفتگی کو دوبالا کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ سفید سفید شگوفوں سے ڈھکے ہوئے ناشپاتی کے پیڑ اب زیادہ

شاداب نظر آرہے تھے۔ بنفشہ کے ننھے ننھے پھول اب برف پاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ لیکن نرگس نہ مٹی میں مانوس خوشبو محسوس کررہی تھی، نہ پھولوں سے شناسائی، اس اجنبیت میں اُس کی نگاہیں اپنے محبوب۔۔۔ بھونرے۔۔۔ کو تلاش کررہی تھیں۔ وہ اُس کی آسمان محبت پر دمکنے والا پہلا ستارہ تھا لیکن گلستان میں اُس کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ نہ جانے نرگس کے کس ازلی دشمن نے بھونرے کو اس سے علاحدہ کردیا تھا۔ یہ سوچ کر نرگس بے حد اُداس ہوگئی۔ اُس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ پھر وہ خود ہی سنبھلی۔ اُسے تو بہار نے یہاں اپنا پیامبر بنا کے بھیجا ہے۔ اس وقت وہ آنسو بہانے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ پیغام نہایت عُجلت آمیز تھا۔ اسی لئے اُسے طویل مسافتیں تیزی سے طے کرنا پڑیں اور گلستان میں داخل ہوتے ہی وہ تھکی ہاری بے خبر سوگئی تھی۔

اُسے جو پیغام لیکر بھیجا گیا تھا وہ یہی تھا کہ بہار بس اب آنے ہی والی ہے۔ مگر گُلستان میں وارد ہوتے ہی اب نرگس کے لطیف وجود پر یہ احساس تازیانے برسا رہا تھا کہ جس موسم گُل کے آنے کی بشارت دینے کے لئے اُسے چمن والوں کے ہاں بھیجا گیا تھا وہ بھلا خود اُس بہار کو دیکھنے کی کہاں متحمل ہوگی۔ اُس کا پیکرِ نزاکت بدن تب تک اس گلستان کے لئے اجنبی بن چکا ہوگا۔ اُس کے پاس تو بس گنتی کی چند سانسیں ہیں۔ وہ بھلا اتنے سن و سال کہاں سے لائے گی۔ جب موسم گُل اپنی تمام تر اُمنگوں اور جولانیوں کے ساتھ اپنے تمام رنگوں اور نکہتوں کے ہمراہ یہاں کی فضا کو مشکبار کررہا ہوگا۔ تب تک تو نرگس گل سڑ کر خاک ہو چکی ہوگی۔ نرگس کی نرگسی

آنکھوں میں آنسوؤں کی جھیلیں جیسے منجمد ہو کے رہ گئیں۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ بہار کی رازداں ہے لیکن جس بہار نے اُسے پیامبر بنانے کے لئے بھیجا ہے۔ وہ خود بھی تو جاؤداں نہیں ہے۔ ساون کے آنے تک بہار کی پیامبر نرگس فنا کے گھاٹ اُتر چکی ہوگی۔ لیکن خود رنگ ونکہت کا پاسباں بہار بھی چمن والوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر عدم کے دھندلکوں میں کھو چکا ہو گا۔ کیا یہ ساری بنجارہ مزاجی ایک تلخ و تُند مذاق سے کسی طرح کم ہے۔!

آفتاب کی ارغوانی شعائیں پیڑوں کے ماتھے پر ندائے صبح کی تحریریں رقم کر رہیں تھیں۔ پتے کرنوں کی روشنی میں جیسے نہار ہے تھے۔ گلستان میں ہر طرف ایک چہکار سی مچی ہوئی تھی۔ چمن والوں کی نظریں جونہی نرگس پر پڑیں تو سبھی پھولوں نے آکر نرگس کو گھیر لیا۔ انہیں بھی شاید نرگس کی آمد کے ساتھ ہی اس بات کا عندیہ مل گیا تھا کہ پھولوں کا متوالا بہار کا شہر یار گلستان میں وارد ہونے والا ہے گلستان کے ہر گوشے میں زبردست گہما گہمی تھی۔ ہر طرف جشن کا سا سماں تھا۔ بہار کی محفل اب بس سجنے ہی والی تھی۔ اِس محفل میں شرکت کرنے والے سبھی نازنین باغ کے میزبان کو گھیر کر اُس سے ایک ہی استفسار کر رہے تھے کہ پھولوں کا متوالا اب کب تک آنے والا ہے؟

میزبان نرگس خاموش اور حیران تھی۔!

وہ اپنی نامُرادی اور لاچاری کی تشہیر نہیں چاہتی تھی لیکن اُس کے منہ سے کوئی راگ کوئی نغمہ پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بھلا کہتی بھی تو کیا۔ کیا وہ ان انجان چمن والوں سے اس حقیقت کا برملا اظہار کرتی کہ بہار کے آنے تک ہم سبھی یکے بعد دیگرے ابدی نیند سو چکے ہوں گے۔۔۔!

تب ہی بُلبل خوش نوا پرواز کرتی ہوئی آئی اور چمن والوں کی صفوں میں شامل ہوکر نرگس سے پوچھ بیٹھی "یہ تو بتاؤ جہاں سے تم آئی ہو وہاں کے کیا حال ہیں؟"

پریشان حال نرگس جسے اس کے سوا کچھ بھی علم نہیں کہ وہاں اُسے محض گلستان میں جا کر متعلقین کو مطلع کرنے کے لئے کہا گیا اور اسے ایک ایسے گلستان میں بھیجا گیا اور ایسے اہل چمن کو بہار کی آمد کے بارے میں آگاہ کرنے کے لئے کہا گیا جو گلستان اور جو اہل چمن موسموں کے ہیر پھیر کے چکرویوہ میں پھنس کے رہ گئے ہیں جیسے کسی نے آندھیوں میں چراغ روشن کیا ہو۔ ایک لمحہ کے لئے نرگس نے سوچا کہ اس معصوم اور سادہ لوح پرندے کو ٹالنے کے لئے وہ اِدھر اُدھر کی کوئی بات کہدے لیکن پھر اُس کے اپنے ضمیر نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ اس پرندے کو طفل تسلی دیکر خاموش کرائے گی لیکن خود اپنے دل کو کیونکر مطمئن کر پائے گی۔

پریشان حال نرگس گلستان کے مظاہر دیکھتی رہی ۔ رات کی تاریکیاں، سحر کی ضیا پاشیاں، صبا کی آمد شبنم کا رقص! یہ سارے معاملات دل کی دنیا میں اک آگ سی لگا دیتے ہیں۔ نسیم سحر صبح کی نیم روشن فضا میں نقب سی لگاتے اور نہ صرف اس کی ساری مہکار لے اُڑاتے بلکہ جاتے جاتے لذتِ خواب سحر میں مشغرق پھولوں کو جگا کر انہیں آہ و بکا کے لئے چھوڑ جاتے۔ یہ کیسا راہزن ہے جو چمن والوں کی ساری متاع عزیز اُڑا لے جاتا ہے اور پھر انہیں ماتم اور بین کرنے کے واسطے جگانے کا نیک فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ پھر جب صبح کی کرنیں روشن ہونے لگتی ہیں تو شبنم پھولوں کے چہرے تر و تازہ

کرتا رہا ممکن ہے کہ نرگس کی اس بات سے تشفی سی ہوتی ہو کہ گلستان مجموعی طور ہمدردی جتانے والوں سے یکسر خالی نہیں ہے لیکن یہ دیکھ کر نرگس مزید حیران پریشان رہ گئی کہ جو شبنم ابھی ابھی اہل چمن کی شگفتگی کا سامان کر رہی تھی اور انہیں زندگی کے ایک نئے دن کی مصروفیات کے لئے گویا تروتازہ بنا رہی تھی۔ وہ خود اچانک صفحہ ہستی سے معدوم ہوگئی۔ نرگس یہ سوچ کر الجھ رہی تھی کہ شبنم اتنی عجلت میں چمن والوں کو بیچ راہ میں چھوڑ کر کیوں چلی گئی کیا شبنم کو اتنی شفقت کا مظاہرہ کرنے کا یہی صلہ ملا کہ اُسے اتنی مختصر حیات کے بعد چمن والوں کو تیاگ دینا پڑا۔

یہ کیسا باغ ہے۔۔۔ یہ اس کا کیا دستور ہے۔۔۔۔۔۔۔! یہ نا قابل فہم واقعات اور یہ پریشان کن سوالات انجام کار نرگس کو اپنی ذات پر غور وفکر کرنے کے لئے مجبور کر رہے تھے۔ اپنے حال واحوال کا محاسبہ کرنے کی تحریک اور اِس طرح اُسے اپنی عجیب صورتحال شناخت کرنے اور تقدیر کی آگہی حاصل کرنے کا ادارک۔۔۔! یہی سب چیزیں اُسے بار بار الجھا رہی تھیں۔ نرگس سوچتی کہ اُس کی زندگی کا نور و سرور بس ایک بھونرے کا عشق تھا۔ اُس کا وصل اُسکی آرزو اور اُس کی سیاہ ذات کا تصوّر تھا۔ بس یہی اُس کی متاع گم گشتہ تھی۔ لیکن جس بے درد نے پہلے مجھے اُس کے عشق میں مبتلا کیا اُسی نے پھر میری اُس محبوب ذات کو کچھ اُس طرح پنہاں کر دیا کہ میرے لئے اس کی حیثیت بس تلاش رنگِ رائیگاں بن کر ہوگئی ہے۔ یہاں میں اُس کی لانہایت محبت میں گرفتار ہوں اور وہ وہاں خود نہ جانے کس کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن میں خود کو اُس کی کیف آگیں گیں گیں کے سوز سے کیسے آزاد کر سکتی ہوں۔

نرگس اپنی ذات اور اپنے گرد و پیش کی حوصلہ شکن صورتحال سے بڑی بد دل ہوگئی ۔ وہ سراپا ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی ۔ ساکت جامد و ششدر۔ بُلبل خوش نوا مسکرا رہا تھا۔ اُسے بڑی دیر سے اپنے سوال کا جواب چاہیے تھا۔ لیکن نرگس سے اُس کے معقول سوال کا بجز اس کے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا کہ بہار چمن والوں کے درمیان عنقریب ہوگی ۔ وہ اتنا نہیں کہہ سکی کہ وہاں کی حقیقت کچھ اس طرح ہے۔ اس سے چمن والوں کے دل ٹوٹ جائیں گے تاہم اہلِ چمن کا تجسس دیکھ کر وہ اس طرح گویا ہوئی:

"اے خُجستہ خیال گُل و بُلبل! تمہاری یہ مُدھر سریلی آوازیں یہ روحانی موسیقی یہ رنگوں کی قوس قزح فطرت کا آئینہ ہے۔ ابھی چند دنوں میں بہار کی خوشبویں تمہارے اطراف کو مُستفیض کرنے والی ہیں لیکن وہ بھی دستِ فطرت کی ہی ایک تخلیق ہے، ہم سب کی طرح ---- فطرت پہلے ہمیں مالا مال کرتی ہے لیکن پھر ایک دن ہم سے سب کچھ چھین کر ہمیں اپنے پاؤں تلے روند دیتی ہے ۔ ہم سب فطرت کے سامنے کس قدر نامکمل اور مبہم ہیں۔ وہ جسے معدوم کر دیتی ہے وہ ابدی سکون میں چلا جاتا ہے لیکن جسے پروان چڑھاتی ہے وہ ہمیشہ اضطراب میں رہتا ہے"

بہار کے راز داں کی آواز میں سچے آنسوؤں کی تلخی تھی چمن والوں کے حلقوں میں اس انکشاف اور اختصار نے ارتعاش سا پیدا کیا۔ شاخوں سے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دینے لگی ۔ جھاڑیوں میں بل کھاتی بیلیں

اور پتوں کے سرگوشیوں کی آواز آنے لگی۔ گلستان جیسے تجلی کے ایک دھارے میں نہا گیا۔ درختوں سے، شاخوں سے پتوں سے ہر چیز سے رنگین روشنی نکل رہی تھی ۔ لیکن پُر کیف غم کی چادر میں لپٹی نرگس بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنی بے بحاشہ آنسو بہار ہی تھی ۔ وہ اتنا روئی کہ اُس کا کلیجہ پھٹ گیا۔ گھاس سر اٹھا کر بولی!

''اے سفر کی عطا بخشنے والی نرگس! آخر تم اتنا کیوں روتی ہو؟''

دم توڑتی نرگس نے جواب دیا۔۔۔۔۔۔''میں روتی ہوں کہ شاید دوسرے ہنس سکیں۔'' یہ کہتے ہوئے نرگس نے آخری ہچکی لی۔ دوسرے دن ٹہنی پر گُلابی کلیاں جھوم جھوم کر ہنس رہی تھیں ۔ گھاس نے شرمندہ ہو کر سر جھکایا۔

☆☆☆☆☆

تلاشِ رنگِ رائیگاں

شگفتہ اور شاداب جنگل اُجلے سُتھرے منظر میں بکھرا مہک رہا تھا سورج کی کرنیں شمشاد اور صنوبروں کی چوٹیوں پر نوید سحر کی تحریریں رقم کر رہی تھیں، درختوں کے پتے آنے والے دن کی تمام اُمیدوں کے ساتھ چمکنے لگے تھے۔ جنگل میں دور دور تک ایک چہکار مچی ہوئی تھی۔ اس دھنک رنگ دنیا کی ڈھلانوں پر حدِ نگاہ تک سبزے کا ایک دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ جس کے درمیان میں صنوبر کا ایک پُرشکوہ درخت کھڑا تھا۔ اس صنوبر کی اونچی اونچی شاخوں کے خواب محل میں ''مُرغ زرین'' کا جوڑا صبا کی فرحت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اُن کے آشیاں میں اتھاہ سکون تھا۔ کیونکہ ان کی کائنات کا مرکز اُن کے سات چھوٹے چھوٹے انڈے اُن کی نظروں کے سامنے تھے۔ ان انڈوں میں گویا مُرغ زرین کے جوڑے کی جان تھی! دھوپ کی جگمگاہٹ میں وہ بس اپنے ان انڈوں کے متعلق ہی باتیں کیا کرتے۔ نر مُرغ زرین جب گھنے بنوں کے اوپر پرواز کرتا تو اُسے دوسرے پرندوں کے انڈے دیکھنے کا اتفاق ہوتا لیکن یہ سبھی اُسے اپنے عزیز انڈوں کے

سامنے ہیچ نظر آتے۔ دونوں پرندے اس خیال سے متفق تھے کہ اُن کے انڈوں کا سارے جنگل میں کہیں جوڑ نہیں تھا۔ دونوں کی نگاہ میں یہ سات کے ساتوں بے مثال اور لازوال تھے۔ چنانچہ ایک دن صبح صبح نر نے یہ موضوع چھیڑا ہی تھا کہ مادہ کہہ اُٹھی۔

"سارے جنگل کے پرندے میرے ان محبوب انڈوں کی خوبصورتی سے جلتے ہیں۔ ان کی یہ ملائم گولائیاں۔ ان کا یہ ہلکا پھلکا سا رنگ و روپ اور دیکھو۔۔۔ ان پہ یہ فطری نشانات کی ترتیب کس قدر دل نشین ہے۔۔۔۔! بے چارے دوسرے پرندوں کے انڈے تو قدرے بے رنگ یا پھر ایکدم گہرے رنگ کے ہوتے ہیں بلکہ کئی ایک تو بے ڈھنگے بھی ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ ابھی کل ہی یہاں سبزے پہ وہ لمبی لمبی چونچ والی مادہ کیڑے چُنتے ہوئے مجھ سے بولی کہ اس کے انڈے پانچ گنا زیادہ بڑے اور زیادہ جاذب نظر ہیں۔۔۔! کم بخت۔ عقل کی دشمن۔۔۔! کیا لاف گزاف کر رہی تھی۔!"

"اری نادان! اتنی سی بات پہ کیوں جان جلاتی ہے۔۔۔۔۔!" نر مُرغ زرین نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔۔۔ "اُن کے انڈے جیسے بھی ہیں۔ ہماری بھلا سے۔۔۔۔۔۔ ہمیں تو اپنے ہی انڈے ہر لحاظ سے مکمل اور بے عیب نظر آتے ہیں۔ بس۔۔۔۔۔!"

"وہی تو۔۔۔!" مادہ خوشی سے چِلا سی اُٹھی۔۔۔۔۔"

"لیکن سوچو تو جب یہ ہمارے خوابیدہ شہزادے نئی زندگی میں آنکھ کھولیں گے تو ہمیں کس قدر مسرّت ہوگی۔۔۔۔اور پھر ایک دن۔۔۔۔جب یہ اپنا دانہ چگنے اور چہچہانے کے قابل ہوں گے۔تب ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوگا۔!"

مُرغ زرین جوڑے کے وہ ایام کتنے پُر کیف تھے گویا خواب راتیں تھیں اور پھول دن تھے۔ پھر ایک دن چھوٹے چھوٹے انڈوں سے ننھے چوزے باہر تاک جھانک کرنے لگے۔اب اُن کا باپ چونچ بھر بھر کر اُن کے لئے غذا لے آتا۔ وہ اپنے ننھے سے منہ کھولے آگے بڑھتے اور اُن کا باپ نہایت شفقت سے دانا اُنکے منہ میں ڈال دیتا جسے وہ فوراً نگل کر مزید غذا کے لئے چلانے لگتے۔۔۔۔اُن کی ماں یہ سب دیکھ کر پھولی نہیں سماتی تھی۔۔۔۔۔۔۔!

"آج میں کتنی خوش ہوں۔ اس نظارے سے مجھے کس قدر آسودگی اور کتنی راحت مل رہی ہے۔۔۔۔۔! ہم دونوں کتنے خوش نصیب ہیں۔۔۔۔اب سمجھ لو میری کوئی خواہش باقی نہیں رہی۔ جیسے سارے سپنے مہک اُٹھے ہوں۔ سارے ارمان نکل گئے ہوں۔۔۔۔۔!" وہ بچوں کو کھلاتی تو اُس کی اپنی بھوک جیسے مر جاتی تھی پھر جب سارے بچے سیر ہو کر آرام سے سو جاتے تھے تب جا کر اسے اپنی ذات یاد آتی وہ بشاش ہو کر اپنے نر مُرغ زرین سے کہتی۔۔۔۔۔"یہ ہمارے نورِ نظر اور یہ ہمارا آشیانہ۔۔۔۔!اس منظر سے میرا یہ دل شاد ہوتا ہے گو ان کی

دھما چوکڑی سے ہمارے گھونسلے میں وقتی طور پر ہنگامہ رہتا ہے اور ہم دونوں کے آرام کے لئے بہت کم جگہ بچتی ہے تاہم اپنے ان سُنہری نونہالوں کو اپنے پروں میں سمیٹ کر اور ان کی چوں چوں سننے سے ساری تھکان اور ساری تکلیف دور ہو جاتی ہے اور ایسی خوشی حاصل ہوتی ہے جو لازوال ہے کیوں؟"

"لیکن یہ سب تو ابھی قبل از وقت کی باتیں ہیں" نر مُرغ زرین نے کہنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر اُس نے چونچ بندر کھنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔۔۔۔کئی ہفتے گذر گئے۔ایک روز خوشگوار شام کا سلونا پن جب رات کی سیاہی میں بدل رہا تھا تو مُرغ زرین نے اپنی مادہ کو حقیقت حال سے آگاہ کرنے کے لئے بات چھیڑ دی۔

"بھلی مانس۔۔۔۔۔! ابھی سے ایسی باتیں نہیں کرتے۔۔۔۔تم یہ ہر وقت شادمانی کا جو اظہار کرتی رہتی ہو۔۔۔۔ یہ تو حقیقت کا صرف ایک چہرہ ہے۔۔۔! تم یہ کیوں نہیں سوچتی کہ ہماری آنکھوں کے یہ تارے ابھی کس قدر معصوم مجبور اور معذور ہیں۔! تم کچھ دن اور انتظار کیوں نہیں کرتی۔۔۔۔۔۔تب ان کے بال و پر نکلیں گے۔انہیں اپنی حفاظت کا شعور ہوگا۔پھر یہ آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے کے اہل ہوں گے اور اپنے سحر انگیز ترنم اور اپنی چمکتی دمکتی سُنہری رنگت سے جنگل کے جلال و جمال میں چار چاند لگائیں گے۔! لیکن جب تلک یہ سب کچھ نہیں ہوگا تب تک سمجھو نہ یہ بچے ہی مکمل ہیں اور نہ تمہاری خوشی۔۔۔۔۔۔۔۔!!"

"ہاں ۔۔۔۔۔!" مادہ کی جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ "کل وہاں سبزے پہ وہ لمبی چونچ والی مادہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ نشیبی جھاڑیوں میں اُس کے نو خیز پرندے دن بھر اُڑانیں بھرتے ہیں۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں ابھی کب تک اپنے لاڈلوں کو پروں میں سمیٹے رہوں گی۔؟ سچ پوچھو تو میں خجالت سے پانی پانی ہوگئی۔ ابھی آج صبح میں نے خود اُس کے چوزوں کو باہر پھُدکتے اور چہچہاتے سُنا۔ اُف کیسی کومل صدائیں تھیں۔۔۔۔!"

مُرغ زرین من ہی من خوش ہوا کہ مادہ کی سمجھ میں اُس کی بات آگئی:

"لہذا ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ ہمارے یہ نازوں پلے شہزادے دوسروں سے پچھڑے نہ رہ جائیں۔۔۔۔۔۔ یہ سب سے برتر تو ہیں لیکن انہیں مضبوط اور با صلاحیت ہونا چاہیئے۔ تاکہ یہ دوسروں سے کہیں زیادہ برق رفتاری سے پرواز کرسکیں۔ یہی کہنا تھا مجھے بس۔!"

اپنے ان نو خیز شہزادوں کو اس قابل بنانے کے لئے جوڑے کو بے حد عرق ریزی سے کام کرنا پڑا۔ بچوں کو بہتر طور کھلانے پلانے کے لئے دونوں پیہم دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ آخر کئی ہفتوں بعد بچوں کے بال و پر نکل آئے۔ اُن کی رگ و پے میں اُمنگیں بیدار ہونے لگیں۔ اب اُن کی تربیت کا نازک اور دشوار گزار مرحلہ درپیش تھا۔ یہ ایام مُرغ زرین جوڑے کے لئے بے پناہ محنت اور ریاضت کے تھے۔ مادہ اپنے صنوبر کی شاخوں سے

بچوں کو اُڑانیں بھرتے کبھی گرتے اور کبھی سنبھلتے دیکھتی رہتی ۔ بے چاری مادہ کی آنکھوں میں عجب بے چارگی اور بے بسی جھلکتی ۔ اُس کے بچے اب اُس کی پُر شفقت آغوش سے دور بھی تھے اور محروم بھی ۔ ۔ ۔ ابھی کل تلک وہ انہیں اپنے پروں میں مستور رکھتی تھی ۔ لیکن آج وہ اکیلے اور بے یار و مددگار تھے اُڑان کا مزہ چکھنے کے لئے انہیں اپنا سب کچھ داؤ پر لگانا پڑ رہا تھا ۔ ممتا مجبور ہو کر چپ رہتی لیکن اُس کی آنکھیں بار بار اشکوں سے چھلک جاتی تھیں ۔ کبھی کبھی ایک احمقانہ سا خیال اُس کے دل میں کروٹ لینے لگتا کہ کل کو وہ اپنے میاں سے کہہ کر انہیں پھر اپنی بے تاب آغوش میں سمیٹ لے گی ۔ ۔ ۔ وہ انہیں اپنے گرم گرم پنکھوں کی محفوظ پناہ گاہ میں سینے سے لگائے رہے گی ۔ جیسے وہ پھر سے وہی پرانے گول گول خوبصورت انڈے ہوں ۔ اُن کے لمس اور ان کے قُرب کے احساس سے ہی اُسے ایک عجیب آسودگی ملتی ۔ ۔ ۔ ایک اتھاہ سکون مِلتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

اُفق پر شفق پھوٹنے کے آثار ہوتے ہی رنگین بادلوں سے اُس کے نازوں پلے شہزادے اپنے باپ کے ہمراہ گھر لوٹتے تو ماں پھولی نہیں سماتی ۔ اُس دن بھی ماں نے آگے بڑھ کر انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اپنے تھکے ہارے نر سے کہنے لگی ”میں تو اب دن سے زیادہ رات ہی پسند کرنے لگی ہوں ۔ کیوں شب بھر میرے بچے میرے پاس رہتے ہیں ۔ مانا کہ تم نے انہیں اب کافی مُستعد بنایا ہے اور مجھے ان کی تہذیب اور تنظیم پہ نازاں ہونا چاہئے لیکن سچ پوچھو تو مجھے وہ پرانی مسرّتیں اب ایک خواب و خیال سی لگتی ہیں ۔ خالی گھونسلہ سارا دن مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے ۔ پھر شام کو جب تم لوگ

لوٹ آتے ہو تو میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے لیکن آنے والی نئی صبح کا خیال مجھے اندر ہی اندر اُداس کر دیتا ہے۔ کاش شام کا یہ خُمار ہمیشہ برقرار رہتا۔!''

نر مُرغ زرین نے اپنی مادہ کو ناگواری سے گھورا پھر تحمل سے اُسے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی ۔۔۔۔۔'' دیکھیں تو ہمارے یہ جذبات بھی فطری ہیں لیکن تم فی الوقت اس لئے مطمئین نہیں کیونکہ معاملات نے ابھی کوئی حتمی شکل اختیار نہیں کی ہے۔ ہمارے نونہالوں کی زندگی کی تہذیب ابھی تک تشنہ تکمیل ہے۔۔۔۔۔۔!انہیں ابھی ذرا اور اہل اور آزاد بننے دو۔ تب کہیں جا کر تمہارے اندیشے دور ہو جائیں گے۔۔۔۔بس ذرا اور انتظار کرو۔۔۔۔۔۔!''

مادہ نے اپنے میاں کے کہنے پر انتظار کی شمع کو بجھنے نہیں دیا لیکن وہ مسلسل انتشار سے اپنا دامن چھڑا نہیں سکی۔

اُمید و بیم عجب مرحلوں سے گُزرتی رہی۔ تنہائی میں وسوسوں کے ناگ اُسے ڈستے رہتے۔ پھر شام کو اُس کے تنومند لاڈلے آ کر اپنی چہکار اور اپنے رسیلے ترانوں سے ماحول کو نشاط انگیز بناتے تو وہ دن بھر کی اپنی ساری ویرانیاں فراموش کر کے انہیں اپنے آغوش میں سمیٹ لیتی لیکن چاہت کی ماری اس بات کو لے کر حیران رہ جاتی کہ بچے اب اس قدر صحت مند ہونے لگے تھے کہ بے چین ممتا انہیں کوششوں کے باوجود سمیٹ نہیں پاتی تھی۔! پھر اُس کی آنکھیں بھر آتیں۔ میرے لاڈلے اب بالغ ہو گئے ہیں۔ وہ واقعی تمام رنگ اور آہنگ لے کر مُرغ زرین بن رہے تھے۔ بادلوں میں دور دور تک اُڑانیں بھرتے اور اپنے ماں باپ ہی کی طرح نہایت میٹھی بولیاں

بولتے تھے۔۔۔۔۔!

"اب انہیں اس آشیاں سے نکل کر اپنے روزگار کی ۔۔۔۔ اپنے گھر بار کی سبیل کرنی ہوگی۔۔۔۔!" نر نے ایک شام اچانک انکشاف کیا۔ مادہ مُرغ زرین اُس کے اس اچانک فیصلے پر ساکت و جامد ہو کر رہ گئی۔ اُسے بلآخر اپنے نر کے کہنے پر بادل ناخواستہ لبیک کہنا پڑا لیکن بے چاری کا دل جیسے ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ نر نے اُس کی زبردست مایوسی بھانپ کر اسے سمجھایا۔۔۔۔۔ "بھلی مانس۔۔۔۔! یہی وہ دن ہے جب ماں باپ کی خوشی کی تکمیل ہوتی ہے۔۔۔۔!"

بچے آشیاں سے چلے گئے۔ ماں کے دل پر غمگین اُداسی محیط ہوگئی۔ شب تنہائی میں بچوں کی یاد آ کر اُسے تڑپا دیتی۔ بے چاری نے ناقابل حصول خواب دیکھے تھے لیکن وہ سبھی نازک محل ڈھیر ہو کر رہ گئے تھے۔ اپنے لخت جگروں کی یاد ایک ایسا نوکیلا کانٹا تھا جس کی تیز نوک سے دل مجروح تھا اور خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔۔۔۔! پھر ایک دن جب اسے کہیں پاس سے بچوں کی چہچہاہٹ سنائی دی تو وہ بے ساختہ اُڑان بھر کر اُن کے پاس چلی آئی۔ وہ دور سے دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔ لیکن وہ سب اُس کی بے چینی سے بے نیاز اپنی پُر شباب دُنیا میں مست تھے۔ یہ عیش و نشاط کی ایک وسیع دُنیا تھی۔ جہاں فردوسی نغمے اور پُر کیف تکلّم تھے۔ ہنستی روتی ممتا چُھپ چھپا کر انہیں دیکھتی رہی اور اُن کی مسرّتوں سے شادمان ہوتی رہی۔۔۔۔۔۔!

دن گزرتے رہے۔ پرندوں کے چہچہے اور فرشتوں کے گیت سنتے ہوئے ایک روز مادہ مُرغ زرین اپنے نر سے کہنے لگی "اب پوری بات میری

سمجھ میں آنے لگی ہے۔۔۔تمہارا خیال صحیح تھا۔خوشی اور صحیح و سچی خوشی کی یہی تکمیل ہوسکتی ہے۔ پہلے میں خود غرض تھی ۔ میں چاہتی تھی کہ میرے یہ لاڈلے صرف میری آغوش میں پناہ لیں۔صرف میرے بن کر رہیں۔کتنی تنگ نظر اور احمق تھی میں۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ لوگ صرف میرے آشیاں میں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ میں یہ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ سورج کی روشنی کا فیض عام ہے۔اس میں کوئی امتیاز نہیں ۔ پھول کی خوشبو سے ہر شخص مساوی طور مستفیض ہوسکتا ہے۔دراصل یہ جنگل خود ایک بڑا گھونسلہ ہے۔اور اس کے مکین ایک وسیع تر کنبے کا حصہ ہیں۔۔۔۔۔۔! آج میں نے اپنی شفقت کے دائیرے رنگ و بو کو تھوڑا اور وسیع کرلیا ہے جس کے نتیجے میں میری خوشیوں کا دائیرہ بھی بہت بڑھ گیا ہے۔۔۔۔۔!اس دائیرے میں آکر آج میں نے خوشی کے بغیر خوش رہنا سیکھ لیا ہے۔۔۔۔۔!!"

مادہ نے توقف کیا تو دونوں میاں بیوی کو ایسا محسوس ہوا جیسے جنگل ایک تماشائی کی طرح خاموشی سے اُن کی باتیں سُن رہا ہو اور اُن کی جدوجہد کا تماشا دیکھتا رہا ہو اور اُن کے نئے ولولوں سے لہلہا رہا ہو۔!

☆☆☆

کندۂ ناتراش

"نہیں ـــــ کبھی نہیں!"

یہ بھی کیا خوب فقرہ ہے جنگل میں سننے کو ـــــ اور وہ بھی موسم گرما کی صبح صبح جب ابھی آفتاب کُہرے کی چادر جھٹک کر باہر جھانک نہیں سکا تھا۔ جب ابھی شبنم جنگلی گھاس سے وداع نہیں لی سکی تھی ـــــ! جب پگھلتے ستارے ابھی اپنی روشنی سُپید سحر پر پوری طرح نچھاور نہیں کر سکے تھے ـــــ! جب مشرق کی سفیدیاں ابھی پوری طرح گُل نار نہیں ہو سکیں تھیں ـــــ! فِطرت ابھی رات اور دن کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل تھی ـــــ!

"نہیں ـــــ کبھی نہیں ـــــ!"

کیا خوب الفاظ ہیں اور وہ بھی جنگل کے ایک نوخیز کی زبان سے۔ جس کو ماضی کے واقعات کا کوئی ادراک نہیں۔ جس کو آنے والے کل کی کوئی پیش بینی حاصل نہیں ـــــ! جو اپنے گرد و پیش کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ کہنے کا اہل نہیں ـــــ! لیکن کیا کیجیئے گا یہاں ہمیشہ نو

خیز اور نا تجربہ کار ہی اپنی آرا کے اظہار کے لئے پیش پیش رہتے ہیں۔۔۔!
چنانچہ صنوبر کے نو خیز پودے نے بھی اپنی نا تمام صلاحیتوں اور فطرت کے جاوداں قوانین سے انحراف کر کے اپنی تمام شاخیں بے تحاشہ اِدھر اُدھر پھیلا دیں تھیں۔ یہ پھیلتی شاخیں اِدھر اُدھر کے اشجار سے متصادم ہونے لگیں لیکن صنوبر کی زبان پر بس وہی ایک بات تھی۔۔۔۔۔۔ "نہیں۔۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔!"

پاس کی ایک ٹہنی پہ بیٹھی گلہری صبح صادق کے انتظار میں اس قدر محو تھی کہ نونہال صنوبر کی نا خوشگوار آواز نے اُسے چونکا دیا۔ وہ اتنی حیران پریشان ہوگئی کہ بے خیالی میں اُس کے منہ سے گھٹلی کا قیمتی خزانہ نیچے گر گیا۔ وہ شاخ در شاخ رینگتی دوڑتی درخت کی اونچائی پہ آگئی اور پھر نیچے غور سے دیکھنے کے بعد بڑ بڑانے لگی۔۔۔۔۔۔ "اوہ فو۔۔۔۔! آخر اِس صنوبر میاں کو ہوا کیا ہے؟"

سچ پوچھیں تو صنوبر میاں کو ہوا کچھ نہیں تھا۔ دراصل اُس کے جوشِ جنون کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ سبھی پیڑ اپنے اَن گنت سنگی ساتھیوں کے ساتھ اس خوب صورت گھنے جنگل کے گُم گشتہ گوشے۔۔۔۔۔ میں آرام سے اُگ رہے تھے وہاں ان کے ساتھ شاہ بلوط تھے۔۔۔۔ شیشم تھے۔۔۔۔۔ سرو تھے۔۔۔۔ چیڑ تھے اور ان کی برادری کے دیگر کئی بھائی بند وہیں کچھ صندل بھی تھے لیکن ان میں چاندی سا چمچماتا ایک نقرئی صندل بھی تھا جو نونہال صنوبر کے سامنے کھڑا تھا۔ صندل کا یہ جاذب نظر اور نرم و نازک درخت نرم و نازک نو خیز صنوبر کی پرداخت کا نہایت قریب سے مشاہدہ کرتا رہا تھا کہ کس

سُرعت سے یہ پیڑ اُگ اور پھیل رہا تھا لیکن اس کے اُگنے اور پھیلنے کے اس مجموعی عمل میں ایک احمقانہ رُجحان بتدریج واضح ہو رہا تھا۔ دراصل یہ نوخیز پیڑ اپنی ذات برادری کے دوسرے درختوں کے ساتھ ساتھ ہر ہمسایہ شجر کے لئے الجھن کا باعث بن رہا تھا۔ وہ اُن کی راہ میں حائل ہو رہا تھا۔ وہ ان کی آسائش سے بھی قطعی بے نیاز تھا۔۔۔!

اگر صندل نے اس سے قبل صنوبر کے ناخوشگوار عمل کا عمیق مشاہدہ کیا ہوتا تو اُس پر یہ رُجحان بہت پہلے واضح ہوا ہوتا لیکن وہ بے چارا تو اپنی دُنیا میں مست رہنے والا تھا۔۔۔۔ بالکل الگ تھلگ تنہا تنہا۔۔۔۔۔! وہ دوسروں کے معاملات میں غیر ضروری تاک جھانک کا قائل بھی نہیں تھا۔ لیکن پھر جب صنوبر اُس کی شاخوں میں گھُس کر اُلجھنے لگا اور اس کی نرم و نازک چھال کہیں کہیں سے اُکھڑنے لگی تب جا کر اُسے اپنی بے چارگی کا احساس ہوا۔ معاملہ گو حد سے تجاوز کر رہا تھا۔ تاہم صندل نے صنوبر کی راہ سے کترا کر نکلنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن یہ لا حاصل ثابت ہوئی کیونکہ مخالف سمت میں بانہیں پھیلانا اُس کے لئے ایک غیر فطری عمل تھا جس کا وہ بہر حال متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ نتیجے کے طور پر صنوبر کی غیر مناسب طور پر بڑھتی شاخیں اس کے لئے عذاب پیہم بن رہی تھیں۔ اُدھر شاخوں کی ٹھونس ٹھانس سے ہوا بھی بند ہونے لگی تھی۔۔۔۔۔!

بلا آخر ایک دن صبح طلوع آفتاب سے پہلے صندل نے اپنی نقرئی شاخیں ایک ذرا پھیلاتے ہوئے جنگل کی پوری برادری کے مفاد میں صنوبر سے کہا۔۔۔۔۔۔

"میاں جی! اگر آپ تھوڑی مروّت سے کام لیں اور اپنی شاخیں بے ساختہ طور میری طرف پھیلانا بند کردیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس نیک عمل سے جہاں خود آپ کو آرام ہوگا وہاں مجھ جیسے آپ کے کئی پڑوسی بھی اطمنان کا سانس لے سکیں گے۔۔۔! آپ بس تھوڑی سی پہل کریں۔۔۔۔۔!!"

یہ سنتے ہی صنوبر کے پیڑ میں زبردست جنبش سی ہوئی۔ اُس کی ایستادگی میں ایک جھکاؤ سا آگیا۔ "ہونہہ! بڑے آئے نصیحت جھاڑنے والے۔ بھلا تم سے نصیحت کس نے طلب کی؟ ہم جیسے بھی ہیں ٹھیک ہیں۔! سمجھے تم۔۔۔۔۔۔ اور ہاں۔ یہ بھلا ہمیں گنجائش کس کے لئے پیدا کرنی ہے۔۔۔۔۔؟"

"میرے اور پاس پڑوس کے دوسرے درختوں کے لئے" صندل نے ضبط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا لیکن نوخیز پیڑ اس سے کچھ زیادہ ہی مغلوب الغضب ہوگیا۔ چنانچہ اب کے اُس نے جو للکار بلند کی تو اُس سے صبح کا سکوت درہم برہم ہوگیا۔ "نہیں۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔!" جنگل کی چھوٹی مخلوق گلہری کی خوبصورت دُم کا ہر بال دہشت سے ہلنے لگا۔

نونہال صنوبر اپنی خودسری کو دیکھنے پرکھنے سے معذور تھا بلکہ اُسے اِس بات پر فخر محسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے صندل کی صلاح کو پوری قوت سے رد کردیا تھا۔ اُس کی گردن انا کی ایستادگی سے تنی ہوئی تھی۔ چنانچہ اپنی طاقت کا زیادہ موثر اظہار کرنے کے لئے اس نے اپنی بظاہر سیدھی سمٹی شاخوں کو غیر فطری طور زیادہ شدت سے اِدھر اُدھر پھیلانا شروع کردیا۔ پھر وہ سہمے

سمٹے صندل کا دِل جلانے کے لئے لاف وگزاف پر اُتر آیا۔۔۔۔۔۔

"واہ۔۔۔ دیکھو تو۔۔۔۔۔ میں نے اپنی شاخوں کے اس الجھاؤ سے کس قدر دلچسپ نمونہ بنا دیا ہے۔۔۔!" اُدھر اُس کی برادری کے دوسرے ہمسایہ بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے "تم لوگ میری ذہانت اور چابکدستی کی داد دو۔۔۔۔! دیکھو میں نے کس کمال سے اپنی ان شاخوں کو ایک دوسرے میں پھنسا دیا ہے۔۔۔۔ ابھی تو گرما کے یہ اُبتدائی دن ہیں آگے جب ہم پہ پوری ہریالی آجائے گی تو ہمارے بناؤ سنگھار سے جنگل کی شان میں چار چاند لگ جائیں گے۔۔۔۔۔۔! جنگلی کبوتر ہماری پتیوں کی بھکی بھکی سی مہک سونگھ کر دوڑتے آئیں گے اور ہماری گھنی چھاؤں میں پناہ لے کر پھولے نہیں سمائیں گے۔ بے چارے ابھی تک کھردری پتیوں والے بے ہنگم درختوں میں سر مارتے رہے ہیں۔ بھلا اُن نوکیلی شاخوں میں ان کے آشیاں چُھپے کیونکر رہ سکتے ہیں۔۔۔!

پاس کے درخت پہ جنگلی کبوتروں کا ایک جوڑا بڑی دیر سے ہمہ تن گوش تھا۔ نر کبوتر سے آخر جب برداشت نہیں ہوسکا تو اُس نے اپنی کبوتری سے پوچھے بغیر ہی صنوبر سے کہا "میاں! تم مانو یا نہ مانو۔۔۔۔۔!

ہم لوگ تو صندل کی چھایا میں ہی مست ہیں۔ ہمیں بس تازہ ہوا اور شفیق سایہ چاہئے اور مالک کے کرم سے یہاں یہ دونوں چیزیں میسّر ہیں۔ تمہارے آس پاس جائیں تو مارے گھٹن کے ہماری

جان ہی جائے گی ۔۔۔۔۔!"

یہ اہم انکشاف کرتے ہی کبوتر نے اپنی گردن واپس گھونسلے میں لاکر اپنی کبوتری کی گردن سے مس کردی لیکن کبوتری اِس بے معنی بحث پہ بگڑ رہی تھی ۔اُس نے اپنے میاں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اس بے معنی بحث میں الجھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔۔۔؟ تم جانو ۔۔۔ یہاں ۔۔۔۔۔ مُحبت کے لئے بھی پورے شب وروز مل نہیں پاتے تو بحث وتکرار کے لئے ہمارے پاس مُہلت کہاں !؟"

مُحبت میں مُستغرق کبوتروں کا جوڑا واپس اپنی دُنیا میں مست ہوگیا۔ شب وروز اسی انداز سے گزرنے لگے کئی ہفتے بیت گئے لیکن صنوبر کی شاخوں میں وہ پختہ ہریالی نہیں آسکی ۔جس کے وہ بلند بانگ دعوے کرتا رہا تھا۔اُس کی برادری کا جھنڈ باہر سے گو ٹھیک ٹھاک نظر آتا لیکن اندر ہی اندر وہ بھورا خشک اور پژمردہ ہو چکا تھا۔ ہر دن گزرنے کے ساتھ صنوبر اور اُس کے ہم جنس اشجار کے رگ وپے میں سرایت کرنے والی یہ خشکی بتدریج بڑھتی جارہی تھی ۔ان کے نوخیز کُنج میں گھٹن کی وجہ سے سانس لینا بھی بھاری ہو رہا تھا۔۔۔۔! پھر چند دن کی موسلا دھار بارش کے بعد جنگل کی ڈھلانوں سے ایک بھاپ سی اُٹھنے لگی ۔۔جنگل کا گوشہ گوشہ سوندھی سی خوشبو سے جیسے مہک اُٹھا۔لیکن صنوبر کے جُھنڈ کی پراگندگی جنّت کی ان مُعطر ہواؤں سے بھی مستفیض نہیں ہوسکی ۔۔۔۔۔!

یہ سب کیا کم تھا کہ نونہال پیڑ اپنی رعونت کی بدبو سے گردوپیش میں

زہر پھیلانے کے درپے رہا۔۔۔۔۔۔۔ پھیلتے رہنے کی اپنی پُرانی ڈگر پہ وہ اب بھی قائم ودایم تھا۔اُسے اب بھی یہ خوش فہمی تھی کہ اُس کی پرداخت فطری انداز میں ہی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔۔!

"ہونہہ۔۔۔۔! بھلا اس سے کیا ہوتا ہے۔۔ ہم اندر سے جیسے بھی ہوں باہر سے تو زیادہ بہتر طور پھل پھول رہے ہیں۔ ہمارے لئے تو ایسی مہمل باتوں پہ سوچنا بھی فضول ہے۔۔۔۔! چلئے آتے ہیں۔ نصیحت جھاڑنے والے۔۔۔۔۔۔!"

اُس کا ہمسایہ اپنی فطرت سے مجبور تھا حالانکہ صنوبر نے اُس کی ذات پہ نت نئے ستم آزمائے تھے لیکن وہ اس حوصلہ شکن صورت حال کے باوجود اپنے مثبت ردّ عمل کا مظاہرہ کرتا رہا۔ وہ اپنے دایئرہ رنگ و بو میں آنے والی خودسری کے اِس مریض کو جنگل کی مہک سے آشنا کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔!

"میاں جی۔۔۔۔! دُنیا کا کوئی بھی درخت اس طرح پروان چڑھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ میری فطری پرداخت کی راہیں تو تم نے مسدود کر ہی دی ہیں۔ لیکن اس طرزِ عمل نے تو تمہاری اپنی پرداخت کا سلسلہ بھی روک دیا ہے۔۔۔۔۔۔!"

نوخیز صنوبر بھلا کیسے چُپ رہتا "بھئی تم تو اُن میں سے ہو جو اپنی کمزوری کو ہی دلآویزی تصّور کرتے ہیں۔۔۔۔! اے بزرگ شجر! ہم لوگ ذرا مختلف مزاج کے ہیں۔ ہمارے خیالات عام خام سے ذرا مختلف اور منفرد ہوتے ہیں۔ جنگل کی گری پڑی

مخلوق بھلا ان نفاستوں کی کیونکر متحمل ہوسکتی ہے۔۔۔۔؟ لیکن تمہاری پیری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم کہہ دیتے ہیں کہ ہم جیسے اعلیٰ وارفع پیڑ اپنی جو راہ متعین کرتے ہیں۔ اُس پہ نہایت عزم سے ثابت قدم رہتے ہیں۔۔۔۔! ہم ہر کسی ایرے غیرے کے آگے جھک کر دبکنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ اِخلاق اور مروّت کی یہ تمہاری مریضانہ نُمایش ہم پہ اثر انداز نہیں ہوگی۔۔۔! خوب سمجھ لو۔۔۔ بڑے میاں!''

یہ کہتے کہتے پُر جوش پیڑ اکڑ کر ایستادہ ہوگیا۔ بے چارے صندل کو اِس بدمزاج اور جاہل دوست پہ بے حد غصّہ آیا لیکن ایک بار پھر اپنا غصّہ پی کر اُس نے نہایت تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا:

''اے صنوبر! تم اِس گھنے جنگل کی شان ہو۔ لیکن آؤ۔۔۔ آج انا کی اُن بلندیوں سے ذرا دیر کے لئے نیچے اُتر آئیں۔ آؤ ایک پھول کی تقلید کرتے ہوئے ہم سخت ڈھنٹل سے باہر آئیں۔۔۔! پھر دیکھو باہر کی ہوا کتنی صاف اور فرحت بخش ہے۔ آؤ ضد اور خود سری کا ملمع اُتار دیں۔ تم جن اونچے خیالات کی بات کرتے ہو۔ ذرا میں بھی تو سنوں کہ آخر اُن اعلیٰ وچاروں کا مطمع نظر کیا ہے؟ کہیں یہی تو نہیں کہ جب بھی تمہارا جی چاہئے تو تم دوسروں کو روند کر آگے نکل جاؤ۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔۔۔؟!''

''تم سٹھیا گئے ہو۔ اے بوڑھے صندل!'' صنوبر نے چلا کر کہا'' ہم فطرت کے ضابطے کے تحت اُگتے ہیں۔ ہمارے اس حق پہ

کوئی انگلی نہیں اُٹھا سکتا۔۔۔۔! ہم تمہاری طرح ازلی غلام نہیں نہ کسی کے پالتو کتے ہیں جو تمہاری طرح دُم ہلانے لگیں۔۔۔۔ خبردار ۔۔۔ آئیندہ ہمارے منہ لگنے کی جسارت نہیں کرنا۔۔۔۔!"

اس طرح بے چارے صندل کی ساری کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں۔ اُس وقت تو بہر حال اس نے کسی طرح چُپ سادھ لی۔ لیکن گرما کی طویل دوپہر کے دوران جب جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا تو جنگلی کبوتر اپنی مادہ کو انڈوں پہ چھوڑ کر پر پھڑ پھڑاتا اُس کی ٹہنی پہ آ کر بیٹھ گیا۔ غصے سے تلملاتے ہوئے صندل نے کبوتروں سے دُعا سلام کے بعد کہا۔۔۔۔

"اب تم ہی بتاؤ،۔۔۔۔ خود کو اور اپنے ہمسایہ کو اس طرح شکستہ حال بنانے سے کیا حاصل؟ افہام و تفہیم سے گذر بسر کرنا ہی اپنے اِس جنگل کا قانون رہا ہے۔ اب اگر ہم اِس قانون سے انحراف کے مرتکب ہوتے ہیں تو اس جنگل کی زرخیزی زردی میں بدلتے کتنی دیر لگے گی۔۔۔ تم بھی اچھی طرح آگاہ ہو کہ صنوبر کی شاخیں اندر ہی اندر بے برگ و ثمر ڈنڈوں میں تبدیل ہو رہی ہیں اور نہایت قلیل عرصے میں اس کی یہ رہی سہی ظاہری ہریالی بھی داستان پارینہ بننے والی ہے۔ مکھیوں اور مچھروں کے ٹڈی دل ان کے گرد پہلے ہی منڈلانے لگے ہیں۔ تم گلہری سے پوچھ لو۔۔۔ اُس نحیف کو بھی اس کی ان شکستہ شاخوں پہ دوڑنے سے خوف آتا ہے کیونکہ یہ کھوکھلی اور کمزور شاخیں اب اُس کا وزن سنبھالنے کی بھی متحمل نہیں رہی ہیں۔۔۔! خود تم نے

اُسے حقیقتِ حال سے آگہی دلائی تھی لیکن یہ نامراد فطرت
کا کوئی بھی اشارہ سمجھنے سے معذور ہے۔ بے شک اب اس
کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔۔۔۔۔۔۔!''

صندل کے آخری الفاظ صنوبر نے بھی سُنے۔ ان تیر و نشتر نے اُس کے رگ و ریشے میں سنسنی دوڑا دی وہ اپنی شاخوں سے جھڑنے والی ایک ایک پتی کو گویا الوداعی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ پھر دوسرے روز صبح ہوتے ہی اُس نے اپنے ایک دور کے رشتہ دار کو سندیش بھجوایا۔ اُس کی سفیر 'لومڑی' نے جب اُن سے یہ جاننا چاہا کہ کیا وہ بھی اپنے پروان چڑھنے کے دوران آس پاس کے پیڑوں کو راستہ دیتے ہیں تو کُنج کے نمایندہ پیڑ نے کہا'' ہاں بھئی! جب کوئی اور صورت نہ ہو تو ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔۔۔۔۔!'' لومڑی نے پھر جب یہی مشورہ تھوڑا نمک مرچ لگا کر صنوبر تک پہنچایا تو وہ غضب ناک ہوا۔

'' ارے اُس کی کیا اوقات کہ مجھے مشورہ دے! میری پتیوں کی
راگنی سے تو سارا جنگل مسحور ہے۔۔۔! میری نشلی چھاؤں میں تو
نیم جاں بھی جی اُٹھتے ہیں۔ وہ نشیب کا باسی۔۔۔۔۔! وہ
میرے نظاروں سے بھلا کہاں واقف! احمق۔ نا معقول!''

اپنے جلال و جمال کی اس تشہیر کے باوجود وسوسوں کے زہریلے ناگ اُس کے باطن میں برابر پھنکارتے رہے۔ اضطراب کا دیمک اُسے اندر ہی اندر چاٹتا رہا۔ جنگل کا ہر درخت ہرا بھرا شگفتہ تھا۔ ہر شجر کے تن بدن پر سبزے کی شال سجی ہوئی تھی۔ بہار نے جیسے جنگل میں حُسنِ ازل کو بے نقاب کر دیا تھا لیکن صنوبر کے جھنڈ کی پژمُردگی اور بوسیدگی اب باہر سے بھی

دیکھی جاسکتی تھی۔ اُدھر سبز قالینوں پہ دیودار اور اُس کی برادری کی بزم آرائیاں ہوتیں اُن کے بیچ صنوبر کو لے کر نہ جانے کیا کیا سرگوشیاں ہوتی رہتیں تھیں۔ لیکن صندل اس سخن ہائے گفتنی میں کبھی شرکت نہیں کرتا۔ اُس نے اب صنوبر سے کہنا سُننا ترک کر دیا تھا۔ بے چارے کی چمچماتی سیمیں چھال اب جگہ جگہ سے اکھڑ گئی تھی۔ اُس کا انگ انگ زخمی تھا۔۔۔۔! اُس کا ریشمی بدن اب بے حد سخت ہو گیا تھا۔ وہ دیدہ نم چپ چاپ ششدر انتشار اور ابتلا کے ایام گزارتا رہا۔ ہر غم اور ہر زخم کا ہمت سے مقابلہ کرتا رہا۔ اُسے یقین تھا کہ انا کی یہ بدبو ایک دن فنا ہو کے رہے گی۔!

پھر ایک دن اچانک۔۔۔۔۔ سارا جنگل انسان کی آواز سے گونج اُٹھا۔ اس آواز کے ارتعاش نے خاموش جنگل میں سنسنی سی دوڑا دی یہ سرکاری عملے کے لوگ تھے جو گھنے جنگل کے اس دور اُفتادہ گوشے میں پیڑوں کی دیکھ ریکھ کے لئے آئے ہوئے تھے۔ وہ غالباً کچھ روز یہاں قیام کرنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے کیونکہ دور سبزے کے ڈھلان پر چھولداری نصب کرنے کی آوازیں چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔۔۔۔۔! پھر دوسرے ہی روز رُک رُک کر آنے والی کلہاڑی کی ضرب کی آوازوں سے پیڑ پودے لرزہ براندام رہ گئے۔ عظیم الشان برگد اور اونچے اونچے صنوبر بھی گرتے ہوئے درختوں کی گونج سے دہل رہے تھے۔ یہ گونج ہر گزرتی گھڑی کے ساتھ بتدریج نزدیک آتی سنائی دے رہی تھی۔ انسانی آواز کی بازگشت بھی اب واضح طور سنائی دیتی تھی۔۔۔۔۔! جھاڑیاں سرسراتیں اور درختوں کے سر بے چینی سے ہلتے نظر آرہے تھے۔

اگلے ہی دن وہ سبھی لوگ ساز وسامان سے لیس صنوبر کے جُھنڈ کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ اُن کی قیادت کرنے والے بزرگ شخص نے اپنی تیز نگاہوں سے جُھنڈ کا مشاہدہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔۔

''افسوس! اِس بے لگام درخت نے ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔
یہاں فوری کاروائی کی ضرورت ہے۔ اس کو کاٹنے سے ہی آس
پاس کے درختوں کو مزید نقصان سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے مُستعد عملے کو ہدایات دینے لگا۔ صنوبر کے حلقے میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ دوسرے ہی پل عملے کے لوگ کُلہاڑیاں لے کر آگے بڑھتے دکھائی دینے لگے۔۔۔۔۔۔۔

'صندل' جواب تک صبر وتحمّل کا بادبان بنا ہوا تھا۔ یلغار کا یہ اچانک منظر دیکھ کر دہل اُٹھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ صنوبر کی جانب جو لوگ بے تحاشہ قدم بڑھا رہے ہیں دراصل انسان نہیں بلکہ پتھر کی چٹان ہیں۔ آس پاس کے سبھی درختوں کی آنکھوں میں گویا الوداعیت کا عندیہ تھا تاہم وہ کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔۔۔۔۔۔! پھر صندل جیسے اُن سب کی زبان بن کر پُکار اُٹھا:

''اے کندہ ناتراش صنوبر۔۔۔۔۔۔۔! یہ سچ ہے کہ ہم میں چھوٹی
موٹی ناراضگیاں رہتی تھیں۔ آپس کی روٹھ راٹھ تو پڑوسیوں میں
ہوتی ہی ہے۔۔۔۔! لیکن دیکھ لو۔۔۔ آج تمہارے خبثِ باطن
کا تعفن انسان کی ذات تک پہنچ گیا۔ اب یہاں تمہاری گرمئ
گفتار کام نہیں آسکتی۔۔۔۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ صاحبِ
جمال کا زوال خود اُس کے اپنے اندر سے شروع ہوتا

ہے۔۔۔۔! ہم سب تمہاری ان خرمستیوں کو بازیچہ اطفال سے تعبیر کر کے نظر انداز کیا کرتے تھے! لیکن اے میرے جوشیلے اور جواں سال عزیز۔۔۔۔! اب تم ایک بے ریا دشمن کے رحم و کرم پر ہو۔ لہٰذا ساری کڑوی کسیلی یادیں بھلا کر اپنے خالق سے لو لگا لو۔ اُسی کو یاد کرو۔ ہم سب دُعا کریں گے کہ تمہاری روح ایک ہی جست میں قفسِ عنصری سے پرواز نہ کرے۔ بلکہ تمہارے عناصر ایک بہتر اور نئی تہذیب کے ساتھ اِس خطہِ ارض کی رگ رگ اور نس نس میں سما جائیں۔۔۔!!"

پھر، تھوڑی دیر بعد۔۔۔ جنگل صنوبر کے جُھنڈ کے گرنے کی گونج سے دہل اُٹھا۔ طیورِ آوارہ شاخوں سے بے تحاشہ بھاگ گئے اور نیلے آسمان کو ڈھک لیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

☆☆☆

بندشیں

روتی چلاتی رخشی کو کہیں دور بورڈنگ ہاوس کی طرف لے جانے والی کار جب دُھول میں کھوگئی تو بزرگ باغبان کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔ وسیع وعریض باغ کا گوشہ گوشہ اپنی ننھی مالکن کے اس طرح چلے جانے پر ویران سانظر آنے لگا۔ باغبان نے جذبات میں آکر اپنا سارا سامان سمیٹا اور اُداس بنگلے کے باہر نکل گیا۔۔۔۔۔۔۔!

''اُف! یہ تم لوگوں کی صفوں میں کس قدر انتشار اور کتنی بے ترتیبی پھیل گئی'' بُزرگ باغبان کے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد موافق ہوا کے ایک جھکڑ نے پھولوں کے کانوں میں سرگوشی کی ''بھئی میں تو تمہاری اطاعت پر حیران ہوں۔۔۔۔۔! تم لوگ جس عجز وانکسار سے ہر اُفتا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہو۔ اُس سے بڑی عاجزی ظاہر ہوتی ہے۔۔۔۔۔! میں نہ جانے کب سے تمہارے اس مالی کے کام کو دیکھتی پرکھتی رہی ہوں۔ اب جب وہ جذبات سے مغلوب ہوکر تمہاری صفوں سے نکل گیا ہے تو مجھے یہ جاننے کا بے حد اشتیاق ہے کہ آخر تم لوگوں کا اپنی غیر فطری پرورش کے متعلق کیا سوچنا ہے

یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کیونکہ ابھی آج ہی میں وہاں اوپر جنگل کی بلندیوں میں تمہاری برادری کے اور لوگوں سے مِل کر آئی ہوں ۔۔۔۔ واہ۔۔۔اُن کی کیا آن بان اور شان ہے۔ وُہ سبھی اپنی ترنگ میں اِدھر اُدھر شاخیں پھیلاتے ہوئے اُگتے ہیں۔ جھاڑیوں کے گرد لپٹ لپٹ کر اٹھلاتے اور بل کھاتے تمہارے وہ رشتہ دار سرو صنوبر اور جنگلی جھاڑیوں پہ چھا جاتے ہیں ۔۔۔۔ اُن کے پھیلاؤ اور اُن کی پرورش پہ کہیں کوئی روک ٹوک نہیں ۔۔۔ لیکن تمہارا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ یہاں تو یہ کم بخت مالی ہر وقت تمہارے پیچھے لگا رہتا ہے۔ وہ اپنی تراش خراش سے تم لوگوں کا حُلیہ ہی بگاڑ کے رکھ دیتا ہے ۔۔۔۔ آہ ۔۔۔۔۔۔ مجھے تو تمہاری دُرگت پر بے حد افسوس ہوتا تھا!"

ہوا کی ان تیرو نشتر سی باتوں نے بے چاری عشقِ پیچاں کو شرم سار کر دیا۔ ساری بیل نے ندامت کے مارے اپنا سر جھکا دیا۔ اُس کی گویا زبان ہی گنگ ہو کر رہ گئی۔ لیکن گُلابی نے نہایت ناز و انداز سے بات آگے بڑھائی۔

"یہ سب جو تم کہتی رہی ہو۔ غالباً پیچاں کے بارے میں مناسب ہوسکتا ہے لیکن اس کا اطلاق کم از کم میری ذات پہ نہیں ہوسکتا۔ تم جانو یہاں کا موسم میری معقول پرورش کے حوالے سے زیادہ سرد اور تر ہے جبکہ میری نو خیزی کے ایام گرمیوں کا تقاضہ کرتے ہیں۔ تاہم جس خصوصی برتن میں میری پرداخت ہو رہی ہے وہ مجھے اُن کیڑوں سے محفوظ رکھتا ہے جو میری جڑوں کو تباہ کرنے پر کمر بستہ ہوتے ہیں۔۔!"

''بہت خوب !'' ہوا نے چلا کر کہا '' گلابی کی معلومات نہایت وسیع ہیں لیکن ۔۔۔۔۔۔۔'' ہوا کے جھکڑ نے پھولوں کی روش کے گرد ایک اُڑان سی لیکر سیٹی بجاتے ہوئے کہا۔

''جب تم مضبوط اور تجربہ کار ہو کر زمین میں اپنی جڑیں پھیلانے کی متحمل ہو تو بھلا یہ نا معقول مالی تمہاری فطری پر داخت پہ پابندی کیوں لگائیں؟ یہ تمہیں فطری طور اُگنے اور پھلنے کا موقع کیوں نہیں دیتے ہیں ۔۔۔۔۔؟ یہ لوگ تمہاری ہر اُس پتی کو فوراً تراش لیتے ہیں جو اُن کی مقررہ اور منتخب روش سے ذرا بھی اِدھر اُدھر سر اُٹھانے کی جُرات کرتی ہو ۔۔۔۔۔! توبہ توبہ ۔۔۔ کاش تمہارے یہ چمچماتے گچھے اپنے من پسند طریقے پہ پھلنے پھولنے کے متحمل ہوتے ۔۔۔ کاش ۔۔۔ تمہارے ہر پھول کے آنکھ کھولتے ہی اُس کی نازک گردن کو ایک چھڑی سے باندھا نہیں جاتا ۔۔۔۔۔۔! فطرت نے تمہیں اتنا حُسن اور اس قدر نفاست بخشی ہے لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تمہیں اپنے فطری انداز میں پلنے بڑھنے پروان چڑھنے کا ایک ذرا موقع نہیں دیا جاتا ۔۔۔۔۔۔۔۔!''

سُرخ گلاب یہ سُن کر اور زیادہ گلنار ہو گیا۔ اپنی اہانت نے اُسے برہم کر کے رکھ دیا۔ دراصل اُسے ہوا کے جھکڑ کا نکتہ معقول دکھائی دے رہا تھا:

''آہ ۔۔۔۔! آج تک میری کتنی تضحیک اُڑائی جاتی رہی

ہے۔ میرے شگفتہ حُسن اور وقار کا تقاضہ ہے کہ مجھے اپنے طور بڑھنے کا بھرپور موقع دیا جانا چاہئے۔۔۔۔۔!"

اُدھر گُلاب کا پودا ہوا کی اختراع سے متاثر نہیں ہو سکا۔ وہ بے ساختہ کہہ اُٹھا "بزرگ باغبان کی نِگاہ داشت میں ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔۔۔۔۔۔۔ رہے وہ جنگلی پھول۔۔۔۔۔۔ اے ہوا۔۔۔۔۔۔۔ تمہارا یہ موازنہ محض احمقانہ فعل قرار دیا جا سکتا ہے۔۔۔۔!"

جھکڑ اس دوٹوک بات پر معذرت طلب کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے آپ کی شان آپ کے امتیاز اور ایک انتہائی زرخیز قطعہ اراضی میں اقامت سے قطعی اِختلاف نہیں۔ میں تو بس یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک باغ میں بھی آپ جیسے ذی شان پودے سے۔۔۔۔۔ فطری طور پروان چڑھنے کا حق چھینا نہیں جانا چاہئے۔۔۔۔۔! کیا یہ بات باعث خجالت نہیں کہ ایک معمولی سا دوکوڑی کا مالی آپ کو غیر فطری طور اُگنے کے لئے مجبور کر دے۔۔۔۔؟ آخر ایک صحت مند گلاب کے پودے کو آزادی سے اُگنے کیوں نہیں دیا جاتا۔۔۔۔!؟ اُس کی بھی تو کچھ اُمنگیں ہوتی ہیں۔۔۔۔ کچھ آرزوئیں ہوتی ہیں۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔!؟"

گُلاب کے پھول ہی کی طرح گُلاب کے پودے کا اعتماد بھی ڈگمگانے لگا۔ خدشات کی تیز کرنیں اُس کو خیرہ کرنے لگیں۔ اُسے بہار اور خزاں کی اپنی سالانہ شاخ تراشی کے اذیت ناک مراحل کی یاد آئی۔ جب

اُس کے پہلو سے اُس کی نرم و نازک شاخوں کا ایک بڑا حصہ ہتھ گاڑی میں لے جایا جاتا ہے:

''یہ تو واقعی ایک ظالمانہ اور وحشیانہ سلسلہ ہے۔ اُف ۔۔! آج تک ہماری یہ کیا دُرگت بنتی رہی ہے۔ ہمارا سابقہ کس قدر بد توفیقوں اور بدمزاجوں سے پڑا ہے۔۔۔۔۔!''

ہوا کے جھکڑ نے شادماں ہوکر باغ کے گرد ایک شوخ چکر لگایا اور پھر صبیح، سوسن کے سامنے گردشیں کرنے لگا۔ سفید سوسن کے متوجہ ہوتے ہی شریر ہوا نے اُس کے لطیف کانوں میں شکوک و شُبہات کا اپنا مخصوص زہر اُنڈیل دیا:

''اب تم بتاؤ۔۔۔ بھلا تمہارے اتنے توانا تنّے کے مقابلے میں یہ بے ہنگم چھڑی کیوں کھڑی کی گئی ہے۔۔۔۔۔!؟''

اِس اشتعال انگیز بات سے سوسن بھی مغلوب الغضب ہوا ''اُس احمق مالی کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے تھی کہ جب دست فطرت نے مجھے اس قدر پُرکشش بنایا ہے تو کیا وہ خالق مجھے اتنی طاقت اور اہلیت نہیں بخش سکتا کہ میں خود کو موافق انداز میں کھڑا رکھ سکوں۔۔۔۔؟ آخر یہ بندشیں میرا مقدّر کیوں بنائیں گئیں۔ میرے نازک اندام وجود کا ہر حصّہ اس قید و بند کے خلاف سراپا احتجاج ہے۔۔۔۔۔۔!''

یہ کہتے ہوئے سفید سوسن نے جھلاہٹ میں اپنا سارا بوجھ بورے کے دھاگے پہ ڈال دیا جس نے اُسے چھڑی سے باندھے رکھا تھا لیکن وہ یہ

بندھن توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہوا کے جھکڑ نے اُس کے پہلو میں ایک لرزش سی پیدا کی اور اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر باغ کے ایک اور دور اُفتادہ گوشے کی طرف فر فر دوڑ لگائی۔۔۔۔۔ یہاں زرد بیل دیوار کے ساتھ اُگائی گئی تھی۔ زرد بیل سنسناتی گیت گاتی ہوا کے ترانوں سے ابھی محظوظ بھی نہیں ہو پائی تھی کہ اُس کے جاذبِ نظر پھولوں نے ہوا کے جھکڑ کی شرارت آمیز باتوں پہ کان دھرا۔ بس پھر کیا تھا۔ دوسرے ہی پل وہ بھی اپنی بُزدلی اور اپنے تقلید پسند مزاج پہ ندامت محسوس کرنے لگے۔۔۔۔!

اُدھر سفید سُوسن جو ہزیمت کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ اب توازن برقرار رکھتے ہوئے ہوا سے پوچھنے لگا۔۔۔۔ ''تم نے تو بھائی ہماری ساری برادری کو غلط سمجھا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے اور میری برادری والوں کو ان ہتک آمیز بندشوں کے سامنے اس لئے جھکنا پڑتا ہے کیونکہ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی اور چارہ کار نہیں۔۔۔! ہاں اگرچہ آج سے تم اپنا پُرقوت تعاون دے دو تو ہم سب ان غیر فطری زنجیروں کو توڑ کے رکھ دیں۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔؟''

ہوا نے یہ بات سمجھ لی کہ معصوم پھول اُس کی ترغیب کے دل فریب پھندے میں پھنس چکے ہیں۔ لہذا اُس نے خوشی خوشی یہ پیش کش قبول کی اور اپنے ہر ممکن اشتراک کا یقین دلایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ زیرِ لب مسکراتا اور سیٹیاں بجاتا ہوا وہاں سے کھسک گیا۔۔۔۔۔!

وہ ساری رات معصوم اور سادہ لوح پھولوں نے اپنی حالتِ زار پر

ماتم کرنے میں گذار دی۔ وِقار کی صلیب پہ ٹنگے وہ ساری رات بندشوں سے رہائی کی سبیل کرتے رہے۔ انجام کار بہت سوچنے کے بعد انہیں اپنی نادانی کا احساس ہو گیا۔ اُن پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہوا کا جھکڑ تو انہیں بیوقوف بنا گیا ہے۔ صبح کے طلوع کے ساتھ یہ خیال بھی شعائیں پھلانے لگا کہ جسے آج تک وہ اپنا خیر خواہ سمجھنے کی غلطی کرتے رہے۔ وہ اصل میں ان کا بدخواہ تھا صبح ہوتے ہی آسمان مٹیالے بادلوں سے ڈھک گیا۔ گرد وپیش کے اونچے اونچے درختوں کی شاخیں اِدھر اُدھر جھکی جا رہی تھیں۔ ہوا کا جھکڑ لوٹ آیا تھا لیکن اب اُس نے اپنا اصلی طوفان خیز اور تُند روپ دھارن کیا تھا۔ ہر وہ چیز جو اُس کی راہ میں آ رہی تھی وہ اُس پر برق بن کر گر رہا تھا۔ ''اب تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔ اے حسین پھولو۔۔۔۔۔۔۔! آخری سفر کی تیاریاں کر لو۔۔۔۔!'' اُس کی سنساہٹ سے نرم و نازک پھول دہل اُٹھے اُدھر ہوا کی صدائے بازگشت سے باغ میں شورِ محشر برپا ہوا۔ اس گرد باد نے عشق پیچاں کے کھمبے کو گرا کے رکھ دیا۔ سفید سوسن کو سہارا دینے والی چھڑی اور اُس کے دھاگوں کو توڑ موڑ کے رکھ دیا۔ سُرخ گُلابوں کی مہین بندشیں بھی ٹوٹ گئیں۔ خود گلاب کے پودے کو ہوا کے حقیقی روپ نے لگ بھگ گرا کے رکھ دیا۔ اُدھر دیوار کے ساتھ آویزاں ارغوانی پھول سبزے پر بکھر کے رہ گئے۔۔۔۔۔! دیکھتے ہی دیکھتے شاداب گلستان ایک ویرانہ بن کے رہ گیا۔۔۔۔۔! پھولوں کی ڈالیاں اب قبرستان کے کتبوں کی طرح ماتم کر رہی تھیں۔۔۔۔! نازک پتوں کی سبز پلکوں کے خواب روندتا ہوا جھکڑ کا گرد باد ژن ژناتا ہوا کسی اور جانب نکل گیا تاکہ وہاں بھی سبز یلے مرغزاروں

کی مہک میں اپنی بدخواہی اور ریاکاری کا زہر گھول سکے۔۔۔۔۔!

ہوا کے جھکڑ کے جاتے ہی آسمان پہ چھائی سیاہ بدلیاں برسنے لگیں۔اُجڑا ہوا گلستان اب مجسم انتشار تھا۔ایک بدتوفیق نے اُسکی یہ حالت بنا کے رکھ دی تھی۔پھر شام ہوتے ہوتے مطلع صاف ہونے لگا اور باغ میں پھولوں کی انجمن اب بمشکل تمام اپنے سر اٹھا کر ایک دوسرے کا حال احوال پوچھنے لگی۔ہوا نے اُن سب کو بے حال کر کے رکھ دیا تھا۔اُن کے وجود کا انگ انگ بے پناہ درد سے کراہ رہا تھا۔اب بارش نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔معصوم اور مضمحل پھول حیران پریشان تھے۔انہیں اب اس بات کا شدید احساس ہو رہا تھا کہ اپنی بندشیں توڑ کر وہ سیدھے کیچڑ میں آ گرے ہیں۔۔۔!اُن کی روح پاک سہی لیکن اُن کا مُعطّر وجود کیچڑے کا حصّہ بنا ہوا تھا۔۔۔۔!

پھر۔۔۔۔۔بعدِ دوپہر جب بزُرگ باغبان خراماں خراماں باغ میں داخل ہوا تو اُسے اپنی آنکھوں پہ جیسے یقین ہی نہیں آیا۔اُس نے جس چمن کو اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا اُس پہ جیسے ایک ہی رات میں بجلی آن گری تھی۔ہرا بھرا شگفتہ گلستان اب ایک ویرانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔۔۔۔وہ ساکت و جامد الم نصیب باغ کو دیر تک کھڑا دیکھتا رہا۔پھر اپنی ساری ہمت مجتمع کر کے اُس نے آگے بڑھ کر کیچڑ میں لت پت پھولوں کے سر اوپر اٹھانے شروع کئے۔اُس کی پلکیں بھیگی ہوئیں تھیں۔اُس کے زرد پژمردہ ہونٹ تھرتھرا رہے تھے:

"آہ۔۔!میرے نازوں کے پالے اِن شہزادوں کے ساتھ اتنا

بڑا سانحہ پیش آیا اور مجھے خبر ہی نہیں۔! کیا چشمِ فلک سے ایسے نظارے بھی دیکھے گئے۔ میں نے ایسا اندھیرا پہلے کبھی محسوس نہیں کیا لیکن میں اپنے اندر کے دئے کو کسی حال میں بجھنے نہیں دوں گا۔ کیونکہ جو امکان برباد ہو گیا اُس کی فریاد لا حاصل ہے البتہ جو امکان باقی رہ گیا مجھے اُسی پر اپنی ساری توجہ لگانی چاہیے۔۔۔۔! لیکن آئندہ پندرہ بیس دن تک فصل کی کٹائی کے سلسلے میں غالباً مجھے مہلت نہیں مل سکے گی۔ زمین دار سے پیشگی روپے لے کر خرچ بھی کر چکا ہوں۔ اُف۔۔۔! کیا میرے اُگائے ہوئے ان نامراد پھولوں کے لئے بازیافت کی کوئی صورت نہیں؟''

بُزرگ باغبان کے بدترین خدشات صحیح نکلے۔ ہفتے بھر میں ہی باغ کا غُنچہ غُنچہ غم کی شبنم سے دُھل گیا۔۔۔۔! کیچڑ میں دھنسے ہوئے نازک پھول جیسے چِتا کی چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو گئے۔

پھولوں کے آخری لمحوں کی کہانی بے حد دردناک تھی۔ اِکا دُکا پھول جو جھکڑ کے غیظ و غضب سے کسی طرح بچ نکلے تھے۔ بندشوں اور سہاروں کے بغیر خود اپنے آپ کو کھڑے رکھنے کے متحمل نہیں تھے۔ بیلیں اور جھاڑیاں بے تحاشہ اِدھر اُدھر پھیل رہی تھیں۔۔۔۔۔!

پھر ایک دن۔۔۔۔۔ پُرشکوہ کوٹھی کے پھاٹک پہ بندھے کُتے کو کسی کا خیر مقدم کرتے سُنا گیا۔ نوکر چاکر اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ رخشی ہوسٹل سے دو ایک دن کے لئے اپنے ڈیڈی کے ہمراہ لوٹ آئی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھی باغ کی طرف دوڑ کر آئی لیکن یہ کیا۔۔۔۔۔۔۔؟

اس کے ہاتھ سے کتابوں کا بستہ ہی چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ وہ اپنے ڈیڈی کی ٹانگوں سے لپیٹ کر زار و قطار رونے لگی۔۔۔۔۔! اُس کے ڈیڈی کا شفیق ہاتھ اس کے کندھے پہ تھپکی دیتا رہا۔ باپ بیٹی دیر تک وہیں سبزے پہ بیٹھے مجسم انتشار بے برگ و ثمر چمن زار کو حسرت و یاس سے دیکھتے رہے۔ پھر کافی دیر بعد جب رخشی کی حالت تھوڑی سی سنبھل گئی تو اُس کے ڈیڈی نے اپنے اندرون کو بے حد طاقت ور بناتے ہوئے کہا:

''یہ واقعی ایک دلِ شکن نظارہ ہے۔ میرے بیٹے!'' یہ کہتے ہوئے اُس کے جسم و روح میں ایک اضطراب پھیل گیا '' ہاں ڈیڈی۔۔۔۔! لیکن آج میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ آپ اکثر صحیح تربیت، تہذیب اور نظم و ضبط کی باتیں کیوں کیا کرتے ہیں۔۔۔۔۔! تیز و تُند ہواوں نے پھولوں کی بندشیں توڑ دیں اور آج یہ غیر منظّم طریقے پہ بے تحاشہ اِدھر اُدھر پھیل رہے ہیں۔۔۔۔ یہ ترنگ کی ماری بیلیں بلا روک ٹوک بے ہنگم انداز میں بڑھی چلی جا رہی ہیں۔۔۔۔۔ آج میں نے یہ بات سمجھ لی کہ اگر حسین پھولوں کے پھلنے پھولنے پر بھی ضبط و اعتدال کی نگرانی نہ ہو تو ایک شاداب و شگفتہ باغ بھی دیکھتے ہی دیکھتے ویرانے میں بدل سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔!''

☆☆☆

مرہم

اصطبل میں وہ سبھی بے حس وحرکت پاس پاس کھڑے تھے لیکن مستان اُن سے ذرا الگ تھلگ کھڑا تھا۔ آسمان پر بادلوں سے نکلا ہوا چاند پورے آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ شکستہ دل مستان بہت دور چاندنی میں چمکتی سفید برفیلی چوٹیوں کو دیکھتا رہا۔ اُس کے دُھندلے شعور میں ان چمکتی چوٹیوں کے اُس پار شاداب چراگاہوں کی یادیں تازہ ہورہی تھیں۔ افسوس وہ طلسماتی دنیا اتنی جلدی دُھند میں لپٹ گئی تھی۔ وہاں آفتاب کہساروں پر ہنہنایا کرتا تھا اور وہ خود کم سن چراگاہ کے آر پار جھاڑیوں کے درمیان آفتاب کا بے تحاشہ تعاقب کرتا رہتا تھا۔ اُسے وہ لمحات یاد آرہے تھے جب وہ اپنی ماں کے تھن میں منہ مارا کرتا اور اُس کے منہ کے آس پاس دودھ جھاگ کی طرح پھیلتا اور دودھ کی افراط سے اُس کا دم گھٹنے لگتا۔ کتنا کیف پرور تھا وہ دودھ۔۔۔۔ اب وہ دن محض ایک یاد بن کر رہ گئے تھے۔

اس کے مالک نے اسے بعض دوسرے ساتھیوں سمیت یہاں مقید کردیا۔ آج دن میں مالک نے اصطبل کی نیم تاریکی میں سب کو اکٹھا

ہونے کے لئے پکارا۔ پھر مالک نے نمک کے سفید ڈلے لکڑی کی لمبی لمبی ناندوں کی طرف اُچھال دیئے۔ سبھی نمک کی نعمت کو نہایت رغبت سے چاٹنے لگے۔ اتنے میں مالک اور اُسکا صحت مند معاون پھندا لئے اُس کے قریب آئے۔ پھندا اچانک اُس کے سر کے اوپر سے پھسلتا ہوا اس کی گردن میں پھنس گیا۔ وہ بے خبر پانی کی بالٹی کے پاس جاکر اپنی پیاس بجھانے کے لئے بڑھا لیکن تب ہی گردن میں پڑا پھندا سخت ہو گیا۔ اس نے وہاں سے نکل جانے کی بھرپور کوشش کی لیکن اب پھندا پوری طرح کس گیا تھا۔ اُس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اُس نے پچھاڑ کھائی۔ نتھنوں سے پھنکار ماری اور پھر بے تحاشہ اِدھر اُدھر دولتیاں چلانی شروع کیں۔ اصطبل کے دوسرے ساتھی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ پھر بہت دیر بعد صحت مند معاون نے دھیرے دھیرے پھندا ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مستان کی سانس بحال ہونے لگی لیکن وہ دیر تک ایک لاش کی طرح وہیں پڑا رہا۔۔۔۔!

کسی نے اپنا منہ اس کے جسم سے رگڑا۔ مستان بیدار ہو اُٹھا۔ یہ اُس کی ساتھی بچھیڑی تھی۔ اس کے ساتھ وہ پلا بڑھا تھا۔ ساتھی نے اپنی پیشانی کے بالوں کو شوخی سے جھٹکا لیکن مستان کی پسلیاں اب بھی ہانپ رہی تھیں۔ اُس کی سنہری رنگت اصطبل کے گرد و غبار میں پچھاڑے کھانے سے سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر غصے سے پھنکار رہا تھا۔ پاس میں اونگھتی ایک بھاری بھرکم گھوڑی نے نوخیز جوڑی کے پاس آکر آہستہ سے کہا۔۔۔۔۔۔۔

"مستان! تم یہاں بندی ہو۔ تم ان لوگوں کے رحم و کرم پر ہو جنہوں نے

تمہاری گردن میں یہ طوق ڈال دیا ہے۔ اب یہ لوگ تمہیں مہارت سے سدھانے کی کوشش کریں گے اور پھر ساری عمر تم ان کے اشاروں پر کام کرتے رہو گے۔ تم یہ پیچ وتاب کھانا چھوڑ دو۔ یہ بپتا ایک تمہیں پر نہیں آئی ہے۔ ہماری ساری برادری کی یہی کہانی ہے۔ کیا سمجھے؟"

بھاری بھرکم گھوڑی کے الفاظ کا پھندا مستان کی گردن میں اس طرح کس گیا کہ چند لمحوں کے لئے اس کا دم گھٹ کے رہ گیا۔ توقف کے بعد اُس نے تجربہ کار ساتھی سے کہا" ---- تم نے کیا یہ سب کچھ صبر و تحمل سے برداشت کیا؟"

"ہاں --- میرے پاس اور کیا صورت تھی اور میاں تم بھی عقل کے ناخن لو اور یوں غضب ناک ہونا چھوڑ دو"۔ اس اشتعال انگیزی سے مستان زیادہ ہی بپھر گیا۔" ----- ہونہہ! تمہاری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم نہیں ہے کہ تم کچھ کر سکو، تمہیں تو بزدلوں کی طرح سب کچھ چپ چاپ سہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ لیکن بڑی بی سن لو میں یہ جبر ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔"

یہ کہتے ہوئے غصے اور نفرت سے ہنہناتا ہوا مستان پچھلی ٹانگوں پہ کھڑا ہو گیا ور پوری شدت سے اِدھر اُدھر دولیتاں چلانے لگا۔ بھاری بھرکم گھوڑی کود کر اپنے گروہ سے جا ملی۔ مستان کے ساتھی بھی حیران و پریشان وہاں سے کھسک گئے۔

پھر اصطبل کا دروازہ کُھلا اور مالک نے اپنے صحت مند معاون سے کہا ---- "اس کم بخت کے ساتھ لگتا ہے کچھ زیادہ ہی محنت کرنا پڑے

گی۔۔۔۔۔۔!"

اضطراب کے کچھ اور دن گزر گئے۔اس دوران برادری کے بڑے بوڑھوں نے مستان کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ برخوردار تربیت کے یہ مراحل کٹھن اور حوصلہ شکن سہی لیکن ان سے کل کو تمہارا مستقبل سنور جائے گا۔۔۔! تمہیں کھانے کو بہتر چارا مل جائے گا۔ایک آرام دہ اصطبل میسّر ہو گا۔لیکن مستان کیلئے یہ طِفل تسلیاں کار گر ثابت نہیں ہو سکیں۔ لگام کے نا خوشگوار ریت کا سرد آہنی دہانہ اُس کے دانتوں سے ٹکرا کر اُس کے منہ میں پھنس جاتا پھر اس کی پیٹھ پر بھاری بوجھ کس کے رکھ دیا جاتا۔اس کا سُنہری سینہ تسموں کے جھٹکوں سے پچکا جاتا۔۔۔۔۔۔وہ کبھی ایک طرف دھکیل دیا جاتا۔تو کبھی دوسری طرف۔۔۔۔!درد سے اُس کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔۔۔۔مستان بھاگنے کی کوشش کرتا تو لگام کا دہانہ اس کے منہ کو پھاڑنے لگتا۔پھر وہ اس اُمید کے ساتھ دائرے میں دوڑنا شروع کر دیتا کہ یہ بلا آخر کہیں ختم ہو جائے گا۔وہ سرپٹ بھاگتا لیکن کم بخت دایرہ ختم ہونے کا نام نہ لیتا۔آخر ہار کر جب وہ شکستہ پا رُکنے لگتا تو مالک کا کوڑا لہرا کر اس کے جسم پر آگ کی لکریں سی چھوڑ جاتا تھا۔ایسی کیفیت میں غضب ناک ہو کر وہ بدحواسی میں اِدھر اُدھر دولتیاں چلانا شروع کر دیتا۔۔۔۔!

اُس رات سزا کے طور اُس کی زین بھی نہیں کھولی گئی۔اُسے پانی بھی نہیں دیا گیا۔منہ میں لوہے کا مُسلسل اور ناخوشگوار ذایقہ اُسے بے حد تنگ کر رہا تھا۔منہ کے سوجھے ہوئے کنارے چھل گئے تھے۔۔۔۔۔۔!پیاس درد اور جلن سے اُس کی جان نکلی جارہی تھی۔۔اُس کی سنہری رنگت اب

پوری طرح مٹیالی ہوگئی تھی ۔۔۔۔۔۔! پھر اُس دن اونگھتی ہوئی بھاری بھر کم گھوڑی سے اُس کی حالت دیکھی نہ گئی۔

"اب دیکھ لو میاں! کیا حالت کر دی اپنی! میں کہتی ہوں اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ کیا سمجھے؟" لیکن پریشان حال مستان نے دولتیاں مار کے کہرام مچا دیا۔۔۔۔۔۔!

مہینوں گزر گئے 'مستان' کے سبھی ساتھی تربیت مکمل کر کے وقار کے ساتھ وہاں سے لے جائے گئے لیکن مستان جیسا تھا ویسا ہی رہ گیا۔ اُس کی نہ ختم ہونے والی تربیت میں سائیس کی نیند بھی حرام ہو کر رہ گئی۔ بلآخر اُس نے بھی ہتھیار ڈال کر اپنی ناکامی کا گویا اعتراف کر لیا۔ اصطبل کے مالک کے لئے یہ کوئی اُمید افزا اطلاع نہیں تھی۔ اسے افسوس اس بات کا تھا کہ ایک جنوں انگیز جذبے نے اتنے نایاب جانور کو بے کار بنا کے رکھ دیا تھا۔۔۔۔ بہت غور وفکر اور مول تول کے بعد اُس نے مستان کو بیچ کر آخر اپنی جان چھڑا لی۔۔۔۔۔!

مستان کا نیا مالک ایک کسان تھا جو دور دراز دیہات میں رہتا تھا۔ وہ طویل سفر کے بعد مستان کو پہاڑوں کے اُس پار اپنے گاؤں میں لے آیا۔ شکستہ جھونپڑی کے باہر اُسے شہتوت کی چھاؤں میں بٹھایا۔ نقاہت کا مارا مستان لگام کے دہانے کو بے تحاشہ چباتے ہوئے گرد و پیش کو غور سے دیکھتا رہا۔۔۔۔ یہاں کی فضائیں کس قدر شگفتہ اور صاف وشفاف تھیں۔

مرغزاروں کی نشیلی ہواؤں سے اُس کے نتھنے تھرتھرانے لگے تب ہی ایک حسین لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور مستان کے ٹوٹے پھوٹے جسم پر اپنے

ہاتھ پھیرنے لگی۔

''بابا۔۔۔تم یہ کتنا اچھا گھوڑا لے آئے ہو۔۔۔۔۔۔! اب تم زائیرین کو پیر بابا کی زیارت شریف تک آسانی سے لے جا سکو گے۔لیکن بابا۔۔۔اس بے چارے کی یہ حالت کس نے کر دی؟''

کسان اور اس کی بیٹی مستان کے کٹے پھٹے جوڑوں کو دیکھ رہے تھے جن سے خون بہہ رہا تھا ۔کسان گھوڑے کو دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے بدن پر تھپکیاں دیں اور اپنی بیٹی کو دلاسہ دیا۔

''بیٹی۔۔۔اس بے زبان جانور کے دل میں نفرت اور خوف کا بیج بویا گیا ہے ۔ اس کی پیٹھ سے نفرت کا یہ بوجھ اُتارنا ہوگا۔۔۔اس کو زنجیروں سے آزاد کرنا ہوگا۔۔۔۔اس کے گردن میں پڑے پھندے کاٹ ڈالنے ہوں گے!''

دونوں باپ بیٹی نے اشک بار آنکھوں سے مستان کو رہائی دلانے کا عمل شروع کیا پھر اُس کے زخموں کے پیرہن مسلسل کئی دنوں کی توجہ کے بعد ہٹائے جاتے رہے۔مستان کے ٹوٹے ہوئے وجود میں ایک بار پھر زندگی کی حرارت دوڑنے لگی۔ اُس کے بالوں کی سنہری رنگت پھر لوٹنے لگی۔۔۔۔! آفتاب کوہساروں پر ایک بار پھر ہنہنانے لگا اور وہ ایک بار پھر۔۔۔۔۔اُسی جوش و جذبے سے دور تک جیسے آفتاب کا تعاقب کرتا۔ پھر شام کو جب کسان کی بیٹی اُس کی گردن تھپ تھپاتی تو 'مستان' کے ہونٹوں

پر اپنی ماں کی تھنوں کے شیرین دودھ کی دھار سی پھیل جاتی۔۔۔۔۔!

اور پھر ایک دن۔۔۔۔ جب باپ بیٹی نے اُس کی پیٹھ پہ صبح صبح وہ شاندار زین کسا تو نہ جانے کیوں۔۔۔ مستان کی رگوں میں بجلی کے کوندے نہیں دوڑے! اُس نے کوئی دولتی نہیں ماری۔۔۔۔ وہ پُرسکون کھڑا رہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پہاڑ کی طرح اٹل۔۔۔۔۔۔۔ گردشِ آفاق کی طرح سرگرم عمل۔۔۔۔۔ خواب کی طرح حسین اور حقیقت کی طرح مُستعد وہ کسان کو اپنی پیٹھ پہ لئے ایک خاص لے اور آہنگ کے ساتھ دوڑتا رہا۔ انتہائی مانوس و مطمین جیسے اس زندگی سے اُس کی برسوں کی شناسائی رہی ہو۔۔۔۔۔۔! دھول بھرے راستوں کو۔۔۔ کشمکش حیات کی راہوں کو، شجاعت کی باہنوں میں لپٹتے دیکھ کر کِسان کی بیٹی اپنی شکستہ جھونپڑی کے دروازے پر پیر بابا کی زیارت کے گیت گنگنا رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔!

☆☆☆

روشنی کے اندھیرے

''قابلِ نفرت سائے۔۔۔تم نے کس قدر فریب سے مجھے اس مصیبت میں پھنسالیا'' دلدل میں گھرے ہوئے مُسافر نے چلا کر کہا۔۔۔۔

''اے تاریک راتوں کے مسافر! تم وہی بات دوہرا رہے ہو جسے میں اب تک سینکڑوں بار سُن چکا ہوں'' اگیا بیتال نے نہایت تحمل سے جواب دیا'' خود پہ لائی ہوئی مصیبت کے لئے مجھے کیوں دوش رے رہے ہو، میں تو اس تاریک اور سنسان رات کو یہاں دلدل کے کنارے رقص کرتا رہا تاکہ آس پاس گزرنے والے مسافروں کو اس جگہ کے خطرات سے محفوظ رکھ سکوں لیکن اے اجنبی۔ تم ایک احمق اور عقل وخرد سے بیگانہ انسان کی طرح میرے کسی بھی اشارے، میری کسی بھی تنبیہ کو نظر انداز کر کے سیدھے موت کے منہ میں آکے گرے ہو۔ اب بھلا اس میں میری کیا خطا ہے!''

''ہاں میں واقعی احمق ہوں!'' دلدل میں بتدریج ڈوبتے ہوئے مسافر نے ہانپتی ہراساں آواز میں جواب دیا'' کیونکہ میں نے تمہاری روشنی کو ایک راہبر اور مہرباں دیا تصور کیا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم یہ بھرم لے کر

میری موت کا بھیانک جال بُن رہے ہو۔!''

''لیکن اے نادان مسافر! یہ جال میرا بچھایا ہوا نہیں تھا۔ میں اپنی روشنی کے راستوں کو نہایت خلوص کے ساتھ جگمگاتا ہوں میری یہ روشنی سمجھ دار لوگوں کے لئے واقعی راہبر ثابت ہوئی ہے۔ یہ کسی کو گمراہ نہیں کرسکتی۔ اب جو تمہارے جیسے لوگ اندھی جُرات اور احمقانہ بے خوفی سے آگے بڑھتے ہیں تو ایسے نامراد لوگوں کے لئے بھلا میں کیا کرسکتا ہوں۔۔۔!''

یہ کہتے ہوئے اگیا بیتال اپنی نیلی پُراسرار روشنی کے ساتھ قہقہے بُلند کرتا ہوا کسی اور جانب نکل گیا۔

☆

''بداعمال سیاہ کار۔۔۔۔'' سیاست کار بے اختیار چلایا کیونکہ اس بار مسافر وہی تھا۔۔۔۔۔ ''کیا تم نہیں جانتے کہ تم کتنی بڑی شخصیت کو اپنے جال میں پھنسانے کے مرتکب ہوئے ہو۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کا مجھ میں زبردست اعتماد ہے۔ میں اراکین سلطنت میں سے ہوں۔۔۔ آہ۔۔۔اب میرے وطن کے لاکھوں بدقسمت لوگوں کی رہنمائی کون کرے گا۔!'' سیاست کار دلدل کے ساتھ ناکام کشمکش کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اُس کی آواز میں آنسوؤں کی تلخی تھی۔

''رہنما۔۔۔۔'' اگیا بیتال کی سیاہی مائل نیلا ہٹوں سے ایک زبردست قہقہہ پھوٹ پڑا۔۔۔ ''تم کیسے رہنما ہو جو اپنی رہنمائی بھی نہیں کرسکتے۔ غالباً تمہارے معاشرے کے ناتمام آداب نے تمہیں چالاکی اور ہوشیاری کی سند دی ہے۔ لیکن اے خودساختہ رہنما تم فطرت کے آفاقی آداب سے قطعی ناآشنا ہو

میری ایک بات کا جواب دو کیا انسانی عقل قریبی چیزوں کا بغور تجزیہ کرنے کی تلقین نہیں کرتی۔ تم تو خود کو شاطر سیاست دان تصور کرتے ہو۔ تمہیں اچھی طرح احساس ہے کہ کب کس مُہرے کو داؤ پر لگانا ہے۔ پھر تمہیں خطرے کا احساس دلانے والی ایک بھٹکتی کرن کو اپنے تحفظ کا ستارا کیونکر تصور کیا۔ افسوس ہے تم پر۔۔۔۔۔ افسوس ہے تمہارے اُن لوگوں پر۔۔۔۔۔ جو تم سے بہتر رہنما تلاش نہیں کر سکے۔۔۔۔۔!"

رہنما پھر کوئی آواز بلند نہیں کر سکا۔ وہ دلدل کی گہرائیوں میں مستغرق ہو چکا تھا۔ لیکن اگیا بیتال بیاباں میں دلدل کے کنارے اپنی تقدیر پر ماتم کرتا رہا۔ وہ خود اپنے ساتھ نہایت مایوسی کے عالم میں بڑبڑا رہا تھا۔

"اس فنا ساماں جہاں میں میری اصل ذات کو کوئی نہیں پہچانتا۔ میں تو خلق خدا کی بھلائی کا متمنی ہوں۔ لیکن میرے اس جذبے کی صداقت پر ہمیشہ شک کیا جاتا ہے۔ مجھے چھلاوہ، غول بیابانی، بداعمال، فریب کار اور نہ جانے کیا کیا کچھ قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ کسی بھی آدمی کی موت مجھے غمزدہ کر دیتی ہے۔ لیکن میں یہ مشعل جلائے رکھوں گا میں اپنی کوششوں سے انحراف نہیں کروں گا۔ کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی ایسا مسافر ضرور آئے گا جسے میں بچا سکوں گا۔۔۔۔۔۔"

☆

"شیطانی بلا۔۔۔۔ وحشی۔۔۔۔۔۔!"

انتہائی خوبصورت لڑکی دلدل میں جکڑتے ہی بے اختیار بازو لہراتی ہوئی چلا اٹھی۔ اُس کی ٹانگیں دلدل میں دھنس چکی تھیں اور

وہ زمین کی ٹھوس سطح کو پکڑنے کے لئے اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہی تھی۔ آنسو اُس کی آنکھوں میں منجمد ہو گئے تھے۔

"اے شیطان صفت وجود۔۔۔۔۔۔تم نے مجھے اس بے رحم موت کی دلدل میں لا کر چھوڑ دیا"

"ہاں یہی ہوتا آیا ہے۔۔۔۔۔۔ ہمیشہ کسی دوسرے پر الزام لگاؤ اور خود کو معصوم و بے گناہ سمجھتے رہو۔ اے نادان لڑکی جب کبھی بھی تم جیسے نا عاقبت اندیش خود کو دھوکہ دیتے ہیں تو انجام کار الزام مجھ پر ڈال دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں تم نے مجھ جیسے شیطان کی تقلید ہی کیوں کی۔ جواب دو؟"

"اے مکروہ عفریت! مجھے کیا پتہ تھا میں تو یہی سمجھی تھی کہ میرا منگیتر مجھ سے چھپ کے ملنے آرہا ہے۔ میں نے تمہاری گھناونی روشنی دیکھ کر یہی سمجھا تھا کہ وہ مجھ سے خفیہ ملاقات کے لئے آرہا ہے ۔۔۔۔اے ظالم سفاک شیطان! میں اب تمہاری ریا کاری کو سمجھ گئی تو لیکن کچھ انصاف کیا ہوتا! کیا میری نو عمر حسین ذات اس بھیانک موت کی گود میں ختم ہو جائے گی۔ کیا میرے معصوم خوابوں کی اُڑان سے پہلے ہی میرے پر کُتر لئے جائیں گے۔ لیکن تمہاری بے رحم ذات کا اس سے کیا بگڑے گا۔ تم تو اپنی وحشت اور بربریت کا ننگا ناچ ناچتے رہو گے!"

"اے نادان لڑکی۔۔۔۔یقین جانو کہ اس گہرے دلدل میں تمہارا نازک اندام بدن ڈوبتے دیکھ کر میں ہرگز خوش نہیں ہوں۔

میرا یہ فرض متعین ہے کہ ایسے لوگوں کو خبردار کر کے بچاؤں جو میرے اشاروں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔اب اسے میری بد بختی سے تعبیر کرو کہ تم جیسے اکثر بے خبر لوگ میرے واضح اشاروں سے انحراف کر کے میرے نیک فعل کو بدی سمجھتے ہو۔جوں جوں تم آگے بڑھتی رہی۔میں نے اپنی روشنی میں زیادہ شدت پیدا کی تاکہ زیادہ چمک دمک تمہیں چوکنا کر سکے لیکن تم اپنی دُھن میں میرے اشاروں کو خاطر میں نہ لاکر برابر آگے بڑھتی رہی۔ نہ جانے کس ظالم ماں نے تمہیں پروان چڑھایا ہے۔جس نے تمہیں اتنی سی بات بھی نہیں سکھائی کہ ایک ثابت قدم کرن جو تمہیں خیر وخوشحالی کی راہ پر گامزن کرے ورایک شوخ آب وتاب اور تڑک بھڑک کی راہ پر لے جانے والی روشنی میں کیسے تمیز کی جاتی ہے۔۔۔۔!

"اف میری ماں! یہ تم اپنی زبان سے کس مقدس شخصیت کا نام لیتے ہو۔تمہیں کیا علم کہ اس نے اپنی اس لختِ جگر کے لئے کتنا تیاگ کیا ہے۔تم بے حس اُس شفقت کا اندازہ لگانے سے معذور ہو"

"اے بدقسمت لڑکی! مقدس تو وہی ہوتا ہے جو زندگی دے اور اس کی طرف جانے والے صحیح راستوں کی نشاندہی کرے" اگیا بیتال کی یہ باتیں سننے کے لئے اب وہاں پر کوئی نہیں تھا۔ لیکن وہ پھر بھی کہتا رہا" کاش تمہاری اُس شفیق ماں نے تمہیں

اپنے گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں سے آگاہ کیا ہوتا۔ تمہیں فطرت کے مظاہر اور ان کے نظام سے واقف رکھا ہوتا۔ مگر کہاں۔۔۔ غالباً انسان کی سوچ اور فکر پر بھی زوال آچکا ہے۔۔۔۔۔۔۔!"

اُن پر پیچ اور ٹیڑھے میڑھے راستوں کے نشیب و فراز پر بوڑھا کسان سنبھل سنبھل کر چلا جا رہا تھا اُس کا صغیر سن بیٹا ایک خچر پر سوار اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا جو پتھریلی راہ کی اونچ نیچ سے بے نیاز اپنے طلسم خیال میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُس کی رگ رگ میں زندگی کے نشاط کی لہر دوڑ رہی تھی۔ اچانک خچر گرتے گرتے سنبھل گیا اور صغیر سنِ لڑکا اپنے خواب و خیال سے بیدار ہو گیا۔ پھر دور اُجالے کے ایک کرن دیکھ کر وہ چونک کر بے اختیار پکار اُٹھا۔

"بابا۔۔۔۔ وہ آ رہی ہے؟"

کون۔۔۔۔ کون آ رہی ہے۔۔۔۔۔۔؟ بوڑھے کسان نے جھلاہٹ سے پوچھا

"ماں"۔۔۔۔۔۔

بوڑھا بیٹے کو کھا جانے والے نظروں سے دیکھنے لگا۔۔۔۔ "وہ دیکھو بابا۔۔۔۔ وہ دور۔۔۔ اُس کے ہاتھ میں لالٹین ہے۔ وہ ہمیں گھر تک راستہ دکھائے گی۔۔۔۔!" بوڑھا بیٹے کی انگلی کی سیدھ میں دیر تک گھورتا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں انجانی چمک آئی۔ اُس نے فوراً خچر کی باگ ہاتھ میں لیکر اُسے روک دیا۔

''بیوقوف! تو کیا تمہارا ارادہ اسی روشنی کی طرف جانے کا تھا۔ ارے جاہل کہیں اگر اس روشنی کے پیچھے سرگرداں رہتے تو یہ تمہیں اُس گھاٹی کی گود میں ہزاروں فٹ نیچے پہنچا کر آتی جہاں سے تمہاری لاش بھی نہیں ملتی۔ نکمے ہو تم بالکل۔۔۔ کیا تم اب بھی نہیں سمجھے۔ تمہاری یہ روشنی دراصل اگیا بیتال ہے جو ہمیشہ ایسی جگہ پر لوگوں کو غلط راہ دکھاتا ہے لیکن یاد رکھو یہ اُن لوگوں کے لئے دوستانہ اشارہ ہے جو اسے سمجھنے کے اہل ہوں۔ یہ چمکتی ہے تو صرف اس لئے تاکہ ہم خطروں سے باخبر رہیں۔'' یہ کہتے ہوئے بوڑھے کسان کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے بلند آواز میں چلا کر کہا۔ جیسے وہ ظلمتِ شب سے مخاطب ہو رہا ہو۔

''اگیا بیتال۔۔۔ میرا یہ نور چشم بھلے ہی تمہیں نہ پہچانے لیکن یہ بوڑھا تمہیں خوب پہچانتا ہے۔ لو ہم اپنا راستہ بدل رہے ہیں لیکن ہمیں باخبر کرنے کے لئے تم نے جو بروقت اشارے کئے اُن سے ہم یقینی موت کے چُنگل میں پھنسنے سے بچ گئے۔ ہم تمہارے ممنون ہیں اگیا بیتال۔ شب بخیر۔۔۔۔۔!''

جب وہ راستہ بدل کر آگے بڑھے تو بیٹے نے خچر کی پیٹھ سے اتر کر باپ سے پوچھا۔ ''لیکن۔۔۔ بابا۔۔۔۔ وہ روشنی کی چمک تو ہمیں گویا اپنی طرف بڑھنے کی دعوت دے رہی تھی۔!''

''نہیں بیوقوف ایسا نہیں۔ یہ دراصل تمہارے سوچنے کا انداز

ہے۔ کیا ایک ملاح سمندر کی لہروں کے درمیان مینارِ نور کو دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ اُسے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اُن ہیبتناک چٹانوں کی طرف بلا رہا ہے جن پر وہ تعمیر ہوا ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ ملاح کو علم ہے کہ مینارِ نور اُسے دور رکھنے کے لئے ہی تعمیر ہوا ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہ غول بیابانی یہ اگیا بیتال ویرانوں اور دلدلوں پر اس لئے چمکتا ہے تا کہ ہم امکانی خطرے سے باخبر ہو کر محفوظ راستوں کو اپنائیں۔ ایک مسافر کا فرض ہے کہ وہ اپنی چشم بینا کو بیدار کرے اور دستِ فطرت کی بے پناہ عنایات سے آگاہ ہو کر اپنے تشکر کا اظہار کرے۔ اب جلدی کرو۔ ہمیں گھر بھی پہنچنا ہے۔۔۔۔"

اگیا بیتال نے دور اندھیرے میں تحلیل ہوتے ہوئے مسافر کی زبان سے شب و بخیر کے الفاظ سُنے تو اُس کی نیلا ہٹوں میں اور اضافہ ہوا۔۔۔ کس قدر اطمنان کی بات ہے کہ میں بلآخر ان لوگوں کی زندگی بچانے میں کامیاب ہوا۔ یہ لوگ اُس کے ممنون بھی ہیں۔ نہیں انسان اس قدر ناشکرا ابھی نہیں ہے جتنا میں نے سمجھنے کی حماقت کی تھی۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے اگیا بیتال نے اپنی روشنی کا آنچل بہت دیر تک اور بہت دور تک پھیلائے رکھا وہ بے تحاشہ ناچتا رہا جیسے ظلمتوں کے افق پر پہلی بار معصوم محبت طلوع ہوئی ہو۔۔۔۔۔!

☆☆☆

مفاہمت

یہ تب کی بات ہے جب رات اور دن نو عمر اور نا تجربہ کار تھے۔ اُن پر ابھی یہ بات واضح نہیں ہو سکی تھی کہ وہ ایک دوسرے کی خوشی اور خوشحالی کے لئے کس قدر نا گزیر ہیں تب وہ نہایت طفلانہ تحقیر کے ساتھ روئے زمین کے گرد ایک دوسرے کا تعاقب کیا کرتے تھے ہر ایک اپنی جگہ یہی سمجھتا کہ بس اُس کا نقطہ نگاہ برحق ہے اور اُس کا حریف ہر لحاظ سے صرف تکلیف اور تخریب کا موجب ہو سکتا ہے جس سے بہر حال نجات حاصل کی جانی چاہیئے۔

کہتے ہیں کہ دونوں یعنی دن اور رات ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ہوتے تھے جہاں رات کی گاڑی کھینچنے والے گھوڑے کی ایال پالے کی تہہ سے ڈھکی رہتی وہاں دن کے گھوڑے کی ایال دھوپ جیسی چمکیلی ہوتی۔ برفیلی ایال سے دوڑتے وقت پسینے کے قطرے سے گرتے جو زمین پر گر کر شبنم کا روپ دھارن کرتے جبکہ چمکیلی ایال اس قدر درخشندہ رہتی کہ ہر قدم پر روشنی بکھیرتی اور اس طرح دونوں ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے مسلسل

چلتے رہے۔

زمین کے طوالت طے ہوتی رہی اور سطح زمین پر اُجالے اور اندھیرے یکے بعد دیگرے منزلیں سر کرتے رہے لیکن دونوں کو کبھی اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ ان کے جھگڑے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے پہلے کون جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ بظاہر یہ معمولی سی چیز طے کر پاتے تو لازمی طور اس بات کا بھی فیصلہ ہو جاتا کہ ان دونوں میں سے آخر زیادہ معتبر اور مقدم کون ہے لیکن اسے کیا کریں کہ دونوں ایک دائیرے میں بے تحاشہ دوڑتے رہے اور یہ نکتہ کبھی طے نہیں ہو سکا کیوں کہ جو فریق ایک جانب سے پیچھے رہ جاتا وہی دوسری جانب آگے آگے ہوتا تھا۔ یہ بات معمولی سے جائزے سے بھی ظاہر ہو جاتی لیکن فریقین نے اس جانب سنجیدگی سے کبھی توجہ ہی نہیں کی۔ پھر اُن کا کوئی راہبر بھی نہیں تھا۔ جو انہیں صحیح اور غلط میں تمیز سکھاتا۔ لہذا وہ پوری شدت اور تسلسل کے ساتھ محوِ سفر رہے۔ وہ کبھی اس بات سے بھی آگاہ نہیں ہو سکے کہ اُن کا سفر ایک دائیرے کی صورت کا ہے اور آپ جانئے دائیرے کے سفر میں اول اور آخر کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ پھر یہ بھی کہ ہے کہ وہ کبھی ایک دوسرے پر واضح سبقت بھی نہیں لے سکے ہاں اگر کبھی ایسی صورت پیدا بھی ہوتی تھی تو وہ جھٹ پٹے کا وقت ہوتا۔۔۔۔!

دو میں سے ایک بڑبڑاتا رہتا اور دوسرا دریدہ دہنی سے جواب دینے پر اُتر آتا، اب اس بات کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں کہ دونوں میں سے کون کس حرکت کا مرتکب ہوتا تھا۔ رات فطرتاً اُداسی اور افسردگی کی مظہر

ہوتی خصوصاً تاریک سیاہ راتوں میں جب گھنے بادل چاند کو اپنی آغوش میں لے لیتے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ رات کی شکایات و حکایات کا لب ولہجہ حُزن و ملال سے لبریز ہوتا۔ اُس کا دل پارہ پارہ ہوتا کیونکہ دن کی روشنی میں جو سرگرمیاں اور عیش ونشاط کی محفلیں سجی ہوتی تھیں رات کی دستک کے ساتھ ہی ان کا خاتمہ ہو جاتا اور جب زمین پہ اس کے تسلط کا وقت آتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ایک دایہ کی طرح اُس کی جھولی میں ایک بیمار بچہ ڈال دیا گیا ہو۔ لازمی بات ہے کہ رات اس سوغات پر مغلوب الغضب ہو جاتی۔ اُدھر دن مسرور وشاد ماں رہتا خصوصاً اس وقت جب سورج طلوع ہوتا تھا وہ کبھی اس بات کی زحمت نہیں اٹھاتا تھا کہ دن بھر کی اُسکی خوش فعلیوں کے بعد رات پر کیا بیتی تھی۔ ہاں وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ اُس کا یہ کھیل کود کا تماشہ رونقِ بزم جہاں کا باعث ہے لیکن ظلمتِ شب سبھی صحت مند سرگرمیوں کا خاتمہ کر کے رکھ دیتی تھی۔

"اے بے حس و بے ضمیر رات! تم میری ہستی کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہو۔ مجھے تمہاری پُر اسراریت پہ نگاہ رکھنے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ مجھے تمہاری کہر پوش ظلمتوں کی غلاف ہٹانے کے لئے زبردست جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ تب کہیں جا کر میں روئے زمین کو اپنی ارغوانی کرنوں سے منوّر کرنے میں کامیاب ہوتا ہوں۔ لیکن ابھی میرا سفر جاری ہی ہوتا ہے کہ تم ویرانیوں کے صحرا لے کر پھر میرے تعاقب میں آجاتی ہو پھر تمہاری ٹھنڈی اور مضر صحت سانسیں دکھوں کے نشتر لے کر مجھ پر وار کرتی ہیں۔ لیکن اے شبِ نامراد! تم کبھی مجھ سے جیت نہیں سکتی۔۔۔ تم کبھی مجھ

سے آگے نہیں نکل سکتی ۔ تمہارا تو بس ایک ہی منشا ہے کہ تم میری اس دلآویز اور رنگین دنیا کو اپنے مکروہ کالے کفن میں لپیٹ سکو!"

"کیا کہا ۔۔۔۔ میں مکروہ ہوں ۔ میں تمہارے اس اندازِ فکر پر افسوس کرسکتی ہوں ۔ دوسروں کو حقیر سمجھنا دراصل ایک بیماری ہے جس کے تم صبح ازل سے شکار ہو ۔ اے بد اندیش اور بدخواہ دن ! خوب جان لو کہ تم زندگی اور توانائی کو ضائع کرنے والے ہو ۔ ہر بارہ گھنٹے کے بعد مجھے تمہاری طرف سے ایک تھکی ہاری ٹوٹی پھوٹی اور شکستہ حال دنیا ملتی ہے اور مجھ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ میں اس کی تجدید کر کے اس کی ساری طاقت اس کی ساری شادابیت اور شگفتگی لوٹا دوں ۔ کیا یہ تعمیر نو ممکن ہے ۔؟ لیکن میں اس ناممکن مہم کا بیڑا اٹھاتی ہوں تاہم تمہاری شکستہ حالی اتنی شدت کی ہوتی ہے کہ میں کبھی کبھی اس کا پورا مداوا کرنے کی متحمل نہیں ہو پاتی اور اس طرح روئے زمین پر تباہی اور موت اپنے خونین پنجے پھیلا دیتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔!"

"لو اور سنو ۔۔۔۔ یہ منہ اور مسور کی دال ۔۔۔ تو گویا اس ساری شکستہ سامانی کا میں ہی ذمہ دار ٹھہرا یعنی وہ جس کے دم قدم سے زندگی پیہم رواں دواں ہے جس کے ریشمی لمس سے ساری دنیا بیدار ہو جاتی ہے ورنہ تمہاری خیر سے یہ ابد تک ہوتی ہی رہے گی ۔۔۔ یاس اور اندھیروں کی ملکہ! موت تو دراصل تمہاری ہی جڑواں بہن ہے جسے تم اپنے پہلو میں لئے پھرتی ہو ۔۔۔!"

"کچھ بھی کہہ لو ۔۔۔ یہ بات مسلّمہ ہے کہ تم دن ہو اور تمہارا کام تباہی ہے ۔ میں رات ہوں اور میرا فرض اُس کی بازیافت ہے ۔۔!"

"نہیں ۔۔۔ میں حیات کا سرچشمہ ہوں اور تم اِسے اجاڑنے والی آسیب ہو۔ میری دانست میں تمہاری حیثیت وہی ہے جو زندگی کے لئے موت کی ہے"

"میں تو کہوں گی اُس صورت میں موت بھی میری ہی طرح بحال کرنے والی ہے۔۔۔۔۔۔!!"

اور اس طرح ۔۔۔ دونوں کے درمیان مکالمہ جاری رہتا۔ اس تکرار میں بھلا حقیقت کیسے اُبھر پاتی ۔ چنانچہ دونوں اپنی اپنی خودفریبی میں مبتلا رہتے اور ایسے ادوار بھی آتے جب دونوں کی چپقلش شدت اختیار کرتی۔ مثلاً گرمیوں میں دن کے گھوڑے اتنے توانا اور تیز وطرار ہو جاتے کہ رات کو ان کا تعاقب کرنے میں بے پناہ دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا کبھی کبھی وہ بہت پیچھے رہ جاتی۔ ایسے ایام میں پھر دن کے لاف وگزاف کا کیا پوچھنا۔ اُسے اپنی کہی ہوئی ہر بات پر پورا اعتماد ہوتا۔ وہ سوچتا کہ اگر وہ اپنی یہ رفتار برقرار رکھ پاتا تو بہت بڑا معجزہ ہو جاتا اس صورت میں دنیا کو رات کی تاریکیوں سے بڑی حد تک نجات مل جاتی" لیکن دن کا المیہ یہ تھا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا رہتا اور اپنی ہمزاد کے متعلق بہت کم سوچتا۔ چنانچہ وہ سوچتے سوچتے اتنا کچھ بھی کہہ جاتا تھا۔۔۔۔۔۔

"اے دشت وجبل ۔۔۔۔ اے مرغزار و لالہ زار۔۔۔ اے اُمنگوں سے بھری خستہ سامان دنیا تم کو اب یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ کون ہے جو تمہارے لئے خوش بختیوں کی بشارت لیکر آتا ہے اور تمہیں زندگی کی حرارتوں سے مستفیض کرتا ہے۔ اے ارض وسما۔۔۔ جان لو کہ یہ سب میرے دم قدم سے ہے۔ جو زمین کے اطراف واکناف میں

زرخیزیت اورنکھار آتا رہا ہے یہ سب میری کوششوں کا ثمرہ ہے۔ دراصل یہ ظلمتِ شبِ محشر نہ ہوتو میں زمین کو زیادہ حسین بنا سکتا ہوں کاش ہمیں تاریکیوں کے اس اژدر سے نجات مل جاتی تب بلاشبہ فردوس بروئے زمین کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جاتا۔ تب یہ شادابیت یہ پھل پھول اور سونے سے بھی سنہری بالیاں ہمیشہ برقرار رہتیں۔!"

اُدھر رات دن کی اس گھن گرج سے مغلوب الغضب ہو جاتی۔۔۔۔۔۔"یہ تو بدُعادے رہا ہے۔ اگر اس کی دعا منظور ہو گی تب اس کرّہ ارض سے زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائے گی۔ ہر ایک سمت تباہی وابتلا کا راج ہو گا۔"

رات دن کے بہروپ سے بیزار رہتی لیکن اُس کی باتوں پر کوئی کان نہ دھرتا لیکن تب ہی اُسے بھی اپنے موقف میں استدلال پیدا کرنے کا موقعہ ملتا۔ کیونکہ جہاں روئے زمین کے ایک طرف موسم گرما ہوتا وہیں دوسرے کنارے پر جاڑا ہوتا۔ اب اس کی گھوڑا گاڑی دن کے اتنے قریب سے گزرتی کہ وہ سمٹنے پر مجبور ہوتا اور یوں وہ دن کو اس کی نصف سے زیادہ روشنی سے محروم کر دیتی۔ رات ایسے ادوار میں حد درجہ اطمنان محسوس کرتی"۔ اب اچھا ہے۔ اب شکستہ اور تھکے ہارے جسم اپنی توانائی بحال کر سکیں گے۔ اب بجھی ہوئی آنکھیں زندگی کی رمق سے پھر روشن ہوں گی۔ اب فطرت کی ساری خفتہ اور پوشیدہ طاقتیں سر گرم ہو سکیں گی۔ اب فاضل مواد کا اخراج دنیا کو آلودہ ہونے نہیں دے گا۔ اب کسی طرح زندگی کا بکھراؤ اس کا انتشار اور اس کی ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ کسی طرح رُک گیا

ہے۔ کاش یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رُک جاتا۔ تب اس پیاری زمین کی واقعی بازیافت ہوتی۔۔۔۔!"

ایسے ادوار میں دن بس پسِ منظر میں رہتا اور کوئی بھی اُس کی طرف کان دھرنے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ البتہ جب جاڑوں کے دوران موسم خوشگوار رہتا تب برفستان کی سطحیں اس طرح چمک اُٹھتیں۔ جیسے ہیرے جگمگا رہے ہوں۔ پھر گردشوں کے ساتھ ساتھ دن رات میں زیادہ سمجھ بوجھ آجاتی۔ وہ دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے تئیں مفاہمت کا زیادہ اظہار کرنے لگے۔ اب افہام و تفہیم کے ساتھ معاملات سلجھانے کی پہل ہوتی۔ بے معنی تکرار کی نوبت بہت کم آتی۔ اب وہ ایک دوسرے کے پیچھے آہستگی سے گزرتے۔ محاذ آرائی یا الجھاو کی کسی صورت حال کو پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اب وہ ایک دوسرے کو زیادہ سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کرتے اور انجام کار۔۔۔ دونوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس روئے زمین کے بعض سنسان حصے بھی ہیں۔ جہاں برفستان کے ویرانے ہیں۔ جہاں سبزہ زار کا کہیں نام و نشان نہیں۔ اس منجمد دنیا کو دیکھ کر دونوں حیران و پریشان رہ جاتے۔

نہ جانے وہ بہشت کہاں تھی جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ شادابیت وہ پھل پھول۔ آخر کہاں تھے وہ سب یہاں تو ایک جھاڑی بھی نہیں بس ایک بے نام موت کا سناٹا ہے۔ دن جو حیات کا سرچشمہ ہونے کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ اپنی اس مملکت پر نظر (؟) ڈالتا جس میں کہیں زندگی کی رمق بھی نہیں ہوتی۔ اُس کا خود سے اعتماد ڈگمگانے لگتا۔ کہیں وہ رات کی کہی ہوئی باتیں سچ تو نہیں ۔کہیں وہی تو نہیں جو زندگی کی احیاء کرتی ہے۔۔۔۔۔!

اُدھر رات جو خود کو بازیافت کی ضامن سمجھتی تھی ان ویرانوں کو دیکھ کر الگ پریشان ہو جاتی۔ یہ ایک ایسی مملکت تھی جہاں بحال کرنے کے لئے کچھ بھی نہ رہا ہو۔ تو کیا وہ صبح کے ستارے سے کہہ دے کہ دن کو واپس لے آئے۔ اُس دن کو جسے وہ پہلے اپنا بدترین مخالف تصور کرتی تھی۔ لیکن اب وہ دل ہی دل میں اُس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی متمنی تھی کیونکہ دن تو واقعی زندگی کا پیامبر ہے اور اُس کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔۔!

دراصل اُن دونوں سے ایک گھمبیر غلطی سرزد ہو چکی تھی لیکن لوگ سنگلاخ مزاحمتوں کے بغیر عقل و دانش حاصل بھی نہیں کرتے۔ تاہم دن اور رات دونوں نے مل کر اس سلسلے میں اچھی شروعات کی، دن نے پہل کر کے کہا"۔۔۔ اے رات میں تمہاری مشفق گھنی چھایا کو موت سے تشبیہ دینے کی سنگین غلطی کرتا رہا۔ دراصل تمہاری پُرسکوت خاموشی میں ہی حیات نو کا جنم ہوتا ہے۔ اے مہربان رات! تم مجھے معاف کرو۔ اور مجھے اپنی مشفق گود میں سلانے کی عنایت کرتی رہو۔۔۔۔۔۔!"

رات نے بھی اپنی لطافتوں کو ندامتوں میں بدلتے ہوئے کہا" میں تمہیں کل تک تباہ کاری کا نقیب تصور کرتی تھی لیکن اے دن ۔۔۔ اے خوبصورت اور چمکدار دوست۔ یہ تم ہی ہو جو میری پرچھائیوں پہ روشنی کئے رہتے ہو۔ اے دن تم تو ازل سے ہی عفو و درگزر کا سرچشمہ رہے ہو۔ مجھے معاف کرو اور اپنے مقررہ موسموں پر لوٹ آؤ تا کہ برفستان کے ویرانے بھی تمہاری تابناک شعاعوں کے لمس سے مستفیض ہو سکیں۔۔۔۔۔۔!"

زندگی کا حسین مرقع ایک نئے پیکر میں نمودار ہوا۔ دونوں دن اور رات اپنے بہروپ سے بیزار ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے رفاقتوں کے نئے سفر پر نئی شان کے ساتھ گامزن ہوئے۔

☆☆☆

آدابِ صحافت

جان محمد آزاد

میں جان محمد آزاد صاحب کی اس کاوش کو کتاب سے زیادہ ایک بشارت جانتا ہوں جو ہماری صحافت کی تابندگی توانائی تطہیر اور تکبیر کی دعا بھی ہے اور اسکا اعلان بھی اس کتاب میں صحافت کے بڑے منصب کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ نئے امکانات کے بیج ہیں جو ضرور بار آور ہوں گے آزاد صاحب ہمارے صحافت شناسوں کی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر اس نسل کے ایک نمایندہ میں صحافت کا یہ تصور ابھر رہا ہے تو اسکا مطلب ہے کہ یہ بجلیاں زیادہ دیر تک بادلوں میں چھپی نہیں رہ سکتیں یہ تڑپ تڑپ کر آخر کار ہمارے زمین دل اور کشتِ ضمیر پہ گر پڑیں

محمد یوسف ٹینگ

(۲)

جان محمد آزاد نے آداب صحافت کے ذریعے ایک عظیم خدمت انجام دی ہے یہ کتاب ایک وثیقہ سمجھی جانی چاہیے کیونکہ اس میں پہلی بار یہاں کے مخصوص حالات میں ابلاغ عام کا جائزہ لیا گیا ہے اور صحافت کے مختلف شعبوں پر ماہرانہ انداز میں بحث کی گئی ہمارے ہاں کے بڑے بڑے صحافی بھی اس کتاب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

یوسف جمیل (نمایندہ بی بی سی)

(۳)

فاضل مصنف نے اس کتاب میں صحافت کے پیشہ کے متعلق کچھ ایسی کارآمد باتیں درج کی ہیں جس سے نو آموز لوگوں کو بے پناہ فایدہ ہو سکتا ہے۔ کتاب کی افادیت اور وسعت میں کوئی تامل نہیں کیوں کہ اس کو عہد حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں لکھا گیا ہے یہ کتاب صحافت کے موضوع پر لکھی گئی جموں و کشمیر کی کتابوں میں ایک قابلِ قدر اور قابلِ داد اضافہ ہے

ابن۔ ابل واتل

(۴)

آداب صحافت لکھ کر آزاد صاحب نے نئی نسل کو ایک بیش بہا خزانے سے مالا مال کر دیا ہے ایک ایسا خزانہ جس کو وہ ہمیشہ ایک لازوال تحفہ سمجھ کر آنکھوں سے لگاتے رہیں گے

اطہر نعیمہ احمد (برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن)

(۵)

جان محمد آزاد کشمیر کے جانے مانے اردو کے قلم کار ہیں۔ آپ کی متوازن تحریریں اپنے آپ ان کی پہچان ہیں وہ تحقیق کی پُرخار وادیوں سے بھی گزرتے نہیں یہی بات ہے جس نے آزاد کو اپنے معاصرین میں ایک الگ پہچان عطا کی ہے۔ ریڈیو سے نشر ہونے کے علاوہ آزاد کی تحریریں مقتدر رسائل میں نمایاں طور پر شائع ہوتی ہیں۔ آداب صحافت سے نو آموز اور آزمودہ کار صحافیوں کے علاوہ عام قاری بھی کسبِ فیض کر سکتے ہیں مجھے یقین ہے کہ آزاد نہ صرف کشمیر میں بلکہ کشمیر سے باہر بھی اپنا لوہا ضرور منوائے گا

موتی لال ساقی



برف ملبوس چوٹیوں کے اُس پار کی سنگلاخ سرزمین ——— یہاں کی جنت بداماں وادیوں میں رہنے والے معصوم لوگوں کے خوابوں ——— حسرتوں اور آرزوؤں کی کہانی۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کے مطابق مصنف نے اس ناول کو بدلتے موسموں کے متنوع رنگوں، سایوں اور روشنیوں میں تحلیل کر کے اس کی شعری تعبیر کی ہے۔ عمر مجید لکھتے ہیں کہ مصنف نے کشمیر اور اس کی روح کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کی عکاسی دل میں اترنے والے رومانی اسلوب میں کی ہے۔ ناول کی زبان صاف اور دُھلی دُھلی سی ہے۔

ظُلمات کے مُسافر





(۱)

پورے ناول میں فطرت کا کردار بھی ایک زندہ تغیر آشنا اور ہم راز وہمدم کردار کی طرح خامشی سے اپنا رول ادا کرتا ہے مطلق العنانیت کے تاریک ترین دور میں استحصال اور جبریت کے شکار مظلوم اور بے زبان انسان کی کہانی۔

پروفیسر حامدی کاشمیری

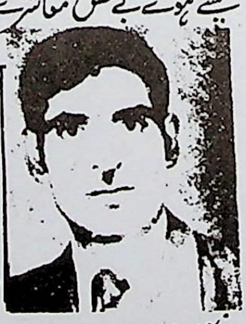
(۲)



آزاد نے شہروں سے دور تھا جو اس کے حسین دھندلکوں میں معصوم زندگی کے پاکیزہ دامن پہ وگرہ شاہی کے جاگیردارانہ نظام کے خونیں رقص کو اپنے خون جگر سے پینٹ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کی نوک سے ان آنسوؤں کو موتیوں کی طرح چن لیا ہے جن میں صدیوں کا ملال چھپا ہوا ہے۔ ماہتاب کے وجود کا ایک ایک ریزہ جاگیرشاہی میں پسے ہوئے بے حس معاشرے کی جبیرہ دستیوں کی داستان ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی

(۳)



کشمیر کی خوبصورتی کی سب داد دیتے ہیں مگر کشمیریوں کے دلوں کے زخم خود کشمیریوں کی نگاہ سے خصوصاً آج کی نئی نسل کی آنکھوں سے ہمیشہ اوجھل رہے ہیں۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ نئی نسل کے قلم کاروں میں جان محمد آزاد نے اس شیش محل پر زبردست پتھر پھینکا ہے اور اُن کا نشانہ چوکا نہیں ہے۔

ڈاکٹر آنند



...جان محمد آزاد کی تحریر استحصال اور جبریت کے شکار مظلوم اور بے زبان انسان کی کہانی ہے۔

(پروفیسر حامدی کاشمیری)

...میں جان محمد آزاد کی کاوشوں کو کتاب سے زیادہ ایک بشارت جانتا ہوں یہ نئے آم کا ...
جو ضرور بار آور ثابت ہو نگے۔

(...)

...جان محمد آزاد نے اپنے قلم کی نوک سے اُن آنسوؤں کو موتیوں کی طرح چن لیا ہے جن میں صدیوں کا ملال چھپا ہوا ہے۔

(ڈاکٹر برج پریمی)

مسرت ہے کہ جان محمد آزاد نے ... ٹھہراو کیا ہے جس میں کشمیریوں کے دلوں کے زخم پوشیدہ ہیں۔

(ڈاکٹر محمد زمان آزردہ)

...جان محمد آزاد پُرخار وادیوں سے کتراتے نہیں یہی بات ہے جس نے آزاد کو اپنے معاصرین میں ایک الگ پہچان عطا کی ہے۔

(موتی لال ساقی)